دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۶۴ وین جلد

از جولائی ۱۹۴۹ء تا دسمبر ۱۹۴۹ء

مرتبہ

سید سلیمان ندوی و شاہ معین الدین احمد ندوی

مطبع معارف پریس اعظم گڈھ

۱۹۴۹ء

سلسلہ تاریخ اسلام

دار المصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کے ساتھ اس کی قدردانی کی بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کرلیا، اس لئے چند برسوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہوگئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم اور اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئے ہیں اور بعض زیر طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے،

تاریخ اسلام حصۂ اول

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لے کر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۹۵ صفحے، قیمت: سے

تاریخ اسلام حصہ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت ۶۶۳ صفحے،

قیمت سے

تاریخ اسلام حصۂ سوم

(بنی عباس اول)

یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ ۷۵۰ء سے ابو اسحاق متقی اللہ ۳۳۳ھ ۹۴۴ء تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، (زیر طبع)

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ، ضخامت :- ۴۳۲ صفحے

قیمت :- صہ

"منیجر"

فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۶۴

جولائی سنہ ۱۹۴۹ء تا دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شعرا

فہرست مضامین معارف

جلد ۶۴

جولائی سنہ ۱۹۴۹ء تا دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۶۴ ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۴۹ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

ہندوستان کے مسلمان جس نازک دور سے گذر رہے ہیں وہ ان کے لیے تاریخ کا کوئی نیا واقعہ نہیں ہے، اس سے پہلے بھی ان کو بڑے بڑے مخالف حالات کا سامنا ہو چکا ہے لیکن ان میں اور موجودہ حالات میں یہ فرق ہے کہ وہ عارضی تھے اور مسلمانوں کو بھی برابر کی قوت آزمائی کا موقع تھا لیکن موجودہ صورت میں کوئی جنگ و تصادم بھی نہیں ہے بلکہ زبانوں پر اتحاد و اتفاق کا نعرہ ہے کہنے کو غیر مذہبی حکومت ہے لیکن واقعہ کے لحاظ سے دونوں میں طاقت اور حقوق کی مساوات کا کوئی سوال نہیں، قانون سازی اور طاقت اکثریت کے ہاتھ میں ہے جس پر کوئی پابندی نہیں، اور اصل چیز قانون نہیں بلکہ اس پر عمل ہے، اور اس کا جو حال ہے وہ سب پر عیاں ہے، ہندوستان سے اسلامی عہد کے تمدن کو مٹانے اور پرانی ہندو تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش جاری ہے مسلمانوں سے ایک زبان اور ایک کلچر کے قبول کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، اردو کو قانونی حیثیت سے ختم کر دیا گیا ہے، یہ اور بات ہے کہ اپنی سخت جانی سے زندہ رہ جائے، ہر شعبہ میں ایسی شکلیں اختیار کی جا رہی ہیں کہ مسلمان خود بخود جگہ خالی کرنے پر مجبور اور ان پر آیندہ ترقی کی راہیں بند ہو جائیں یہ حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ ہو مگر واقعہ ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے،

ان حالات میں ایک کانگریس سے انصاف کی توقع ہو سکتی تھی لیکن اب وہ بھی عملاً فرقہ وارانہ ادارہ بن کر رہ گئی ہے، کچھ اشخاص ضرور ایسے ہیں جو کانگریس کے اصولوں پر قائم ہیں اور مسلمانوں

کے ساتھ انصاف چاہتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم اور انکی آواز بالکل بے اثر ہے، بلکہ اب تو مسلمانوں کی حمایت بھی جرم ہو گئی ہے، مسلمانوں کے "بہادر" لیڈروں نے پاکستان کی راہ لی، تو یہ مسلمانوں کی کوئی شنوائی اور حیثیت باقی نہیں ہے، ان میں سے جو لوگ وزارت کی کرسیوں، حکومت کے عہدوں اور اسمبلیوں کے ایوانوں میں ہیں، ان کو اب صرف اپنے عہدوں کے تحفظ کی فکر ہے اور اسکی لذت و حلاوت کے لیے وہ ہر تلخ سے تلخ گھونٹ پی جاتے ہیں اور ان کی پیشانی پر شکن تک نہیں آتی، کچھ لوگ آیندہ کی امید میں لو لگائے بیٹھے ہیں، اور جن کو ان کی وفاداری کا صلہ مل جاتا ہے، وہ میدان چھوڑتے جاتے ہیں جو مرد قلندر ان پھندوں سے آزاد ہیں انہی سے آیندہ توقعات وابستہ ہیں لیکن وہ دن دور نہیں جب انکا شمار معتوبین کے زمرہ میں ہو جائے گا۔

انسانوں کو انسانی حقوق سے محروم کرنے میں ہندوستان کو ہمیشہ سے کمال حاصل رہا ہے. جس کی مثال اچھوت ہیں، مسلمانوں کی موجودہ حالت بھی ان سے کم نہیں ہے، بلکہ اچھوتوں کی اصلاح و ترقی کی کوشش ہو رہی ہے، ان کو حقوق مل رہے ہیں، اور مسلمانوں سے ان کے پرانے حقوق بھی چھینے جا رہے ہیں، جس کا ثبوت کونسلوں اور اسمبلیوں میں ان کی نشستوں کے تحفظ کا خاتمہ ہے، اس لیے اس کا خطرہ ہے کہ اچھوتوں کی اصلاح و ترقی سے ہندوستان کے پرانے نظام میں جو خلا پیدا ہوگا وہ مسلمانوں سے پر کیا جائے، تاہم ان حالات سے ان کو مایوس اور خوفزدہ نہ ہونا چاہیے، ناامیدی اور غیر اللہ کا خوف مومن کی شان کے خلاف ہے، البتہ اس نکبت و ادبار کے اسباب کی تلاش اور ان کے ازالہ کی تدبیر ضروری ہے، ورنہ اگر یہ احساس بھی جاتا رہا تو پھر ان کی تباہی میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہ جائے گا،

اگر مسلمانوں میں زندہ رہنے کی قوت باقی ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ان کو ختم نہیں کر سکتی

قوموں کی موت وزیست اور ترقی وتنزل کا مدار ان کی کمیت یعنی عددی قلت وکثرت پر نہیں بلکہ ان کی اندرونی کیفیت پر ہے، جوہر فولاد کو پتھر کی چٹانیں بھی نہیں توڑ سکتیں، اور خاک کے ڈھیر کو ہوا کا جھونکا بھی اڑا سکتا ہے، ہر قوم کی حیات کا کوئی نہ کوئی سرچشمہ ہوتا ہے جس سے اس کو زندگی ملتی ہے، اور ہر قوم کسی نہ کسی نصب العین کے لیے زندہ رہتی اور اسی کے لیے آگے بڑھتی ہے، خواہ وہ وطنیت ہو، قومیت ہو، مذہب ہو یا اور کوئی نصب العین ہو، مسلمانوں کے لیے زندگی کا یہ سرچشمہ اور نصب العین مذہب ہے، انھوں نے دنیاوی عروج بھی اسی کے سہارے حاصل کیا ہے، اور آیندہ بھی اسی کے سہارے زندہ رہ سکتے ہیں، مذہب ہی ان میں ایمان وعمل کی اصلی روح، خدا کی ذات پر اعتماد و توکل کے ساتھ اپنے نصب العین کے حصول کے لیے جد وجہد، سعی وعمل، اس کی راہ میں ایثار وقربانی، اخلاص وصداقت، سادگی وجفاکشی وغیرہ اوصاف واخلاق فاضلہ پیدا کر سکتا ہے جو دین کے ساتھ دنیاوی ترقی کے بھی سب سے بڑے وسائل ہیں، اور جو قوم بھی ان اوصاف سے متصف ہوگی اس کو کوئی طاقت نہیں دبا سکتی، اسی کے ساتھ دین ہی ملک و وطن کی حق شناسی بھی سکھاتا ہے، اور ان کی صحیح خدمت بھی دین ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔

اسلام میں دنیا بھی دین ہی کا ایک شعبہ ہے اور اسلام کا مقصد مسلمانوں کی دنیاوی ترقی اور سربلندی بھی ہے اور اس کو ایمان اور عمل صالح کا لازمی نتیجہ قرار دیا گیا ہے، اس لیے اگر مسلمان دنیاوی عروج وترقی سے محروم ہیں تو سمجھ لینا چاہیے، کہ ان کے مذہبی اعمال ناقص ہیں، اسلیے جس طرح مسلمانوں پر دوسرے مذہبی اعمال فرض ہیں اسی طرح کسب دنیا کے دنیاوی وسائل پر عمل اور ہر صالح ترقی کے میدان میں مسابقت کی جد وجہد بھی ان کیلیے ضروری ہے لیکن قومی ترقی کا اصل معیار حکومت کے عہدے اور سرکاری ملازمتیں نہیں بلکہ تعلیم اقتصادیات، صنعت وحرفت اور تجارت زراعت وغیرہ میں ترقی ہے، حکومت کے چند عہدوں سے پوری قوم کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے، اسلیے مسلمانوں کو حکومت کی دریوزہ گری چھوڑ کر ترقی کے اصلی میدانوں میں آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے، اگر اسمیں وہ کامیاب ہو گئے تو پھر حکومت بھی انکی قوت اور انکی سیاسی حیثیت ماننے پر مجبور ہوگی، ورنہ محض ماتم گساری سے کچھ حاصل نہیں۔

مقالات

کلچر کی وحدت کا مقصد!

از

شاہ معین الدین احمد

آزاد ہندوستان کی تعمیر کے سلسلہ میں جو نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں ان میں ایک مسئلہ قومیت اور کلچر کی وحدت کا بھی ہے یعنی ہندوستان ایک ملک ہے یہاں کے سارے باشندے ایک قوم ہیں، اس لئے بلا اختلاف مذہب وملت یہاں کا کلچر بھی ایک ہونا چاہئے، بظاہر یہ دعوی کوئی غیر معقول نہیں ہے، لیکن اس کی تفصیل بحث طلب ہے، اور محض اجمالی دعوی پر وحدت قومیت اور وحدت کلچر کے مسئلہ کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، بلکہ علمی حیثیت سے اس پر بحث کی ضرورت ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندے خصوصاً ہندو مسلمان ایک قوم ہیں یا دو قومیں، اور ایک ملک و قوم کیلئے وحدت کلچر کس حد تک ضروری ہے، پھر کلچر کے کن اجزاء کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جن پر کسی فرقہ کی جماعتی حیثیت کا مدار ہوتا ہے، اور جن کے بغیر اس کی انفرادیت قائم نہیں رہ سکتی، اور کس حد تک دوسری قوم کے کلچر کے اثرات قبول کئے جا سکتے ہیں، اس اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کا کلچر کہاں تک عربی یا اسلامی ہے، اور اس میں ہندو کلچر کے کیا اثرات ہیں، پورے ہندوستان کا کلچر کسی زمانہ میں بھی ایک رہا ہے یا مختلف، موجودہ ہندو کلچر کہاں تک

خالص ہندو ہے، اس میں بیرونی اثرات کیا ہیں، کسی قوم و ملک کیلئے پرانے کلچر پر قائم رہنا مفید ہے یا اس میں ترقی پسندی، اس قبیل کے اور بہت سے سوالات کی روشنی میں اس مسئلہ کا صحیح فیصلہ ہو سکتا ہے، ان مسائل پر معارف میں بارہا اظہار خیال کیا جا چکا ہے، لیکن شذرات میں تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں ہوتی اس لئے اس مسئلہ پر مستقل مضمون لکھنا مناسب معلوم ہوا،

ہندو مسلمان ایک قوم ہیں یا دو قومیں

قومیت کے حسب ذیل عناصر ہیں، وطن، نسل، مذہب، زبان، روایات، تمدن، سیاست، اور مقاصد کا اتحاد و اشتراک لیکن وحدت قومیت کے لئے ان تمام عناصر کا پایا جانا ضروری نہیں ہے، بلکہ ان میں سے چند چیزوں میں اشتراک بھی وحدت قومیت کے لئے کافی ہے، البتہ جس قدر اشتراک زیادہ ہوگا اسی قدر قومیت کامل اور مضبوط ہوگی، اس تعریف کے اعتبار سے قومیت کی کامل وحدت تو دنیا کے بہت کم حصوں میں پائی جاتی ہے، حتیٰ کہ یورپ کے چھوٹے چھوٹے مختلف ملکوں میں بھی قومیت کے تمام عناصر میں پوری وحدت نہیں ہے، اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں، کسی باخبر شخص کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن مطلق اور کسی نوع کی قومیت سے کوئی ملک و قوم بھی خالی نہیں ہے، اور ان سب میں قومیت کے چند یا بیشتر اجزاء میں اشتراک موجود ہے، جو وحدت قومیت کے لئے کافی ہے، اس لحاظ سے ہندو مسلمان ایک قوم ہیں، وطنیت اور ملکی سیاست اور بیشتر مقاصد میں دونوں کا اتحاد ہے، نسل میں بھی بڑی حد تک وحدت پائی جاتی ہے، اگر مشترک زبان اور تمدن کو نہ مٹایا جائے تو بڑی حد تک ان دونوں میں بھی اشتراک ہے، صرف مذہب اور روایات دونوں کی مختلف ہیں، گویا عناصر قومیت میں سے صرف دو میں اختلاف اور باقی میں وحدت یا اشتراک ہے، اس لئے بیشتر عناصر قومیت کے لحاظ سے دونوں ایک قوم ہیں، بشرطیکہ ان کو مٹایا نہ جائے، جن قوموں کے تمام عناصر قومیت میں وحدت ہے ان کا کلچر بھی لازمی ایک ہوگا،

لیکن جن میں کامل وحدت نہیں ہے تو ان کے اختلافی عناصر کا بقا اور ان کا تحفظ خواہ وہ زبان ہو یا کلچر ہو یا مذہب، ان کا بین الاقوامی آئینی حق ہے، اس لئے مسلمانوں کا کلچر جس حد تک ہندوؤں سے مختلف ہے اس کا تحفظ حکومت کا قانونی فرض ہے،

کلچر کی تعریف

کلچر ان افکار و تصورات اور نظام زندگی کو کہتے ہیں جس سے کسی قوم کے درجۂ تہذیب کا اندازہ ہو سکے، اور اس میں مابعد الطبیعی عقائد و خیالات سے لیکر حکومت و سیاست، تہذیب و معاشرت اور علوم و فنون سب شامل ہیں، آسانی کے خیال سے ان کی چار موٹی تقسیمیں کی جا سکتی ہیں، ایک مذہبی عقائد و عبادات جیسے توحید، رسالت، حشر و نشر، روزہ، نماز، حج اور زکوٰۃ، دوسری نیم مذہبی معاشرتی مراسم جیسے نکاح، طلاق، خلع، وراثت وغیرہ، تیسری ملی روایات اور زندگی کے مختلف شعبوں میں مذہب کے اثرات، چوتھی عام تہذیب و معاشرت، ان میں سے پہلی چیز یعنی عقائد و عبادات تو ہر فرقہ کیلئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے بغیر مذہب ہی کا وجود نہیں ہو سکتا اور نہ مسلمان مسلمان کہلا سکتا ہے اور نہ ہندو ہندو، دوسری چیز یعنی نیم مذہبی معاشرتی مراسم گو وہ ارکان دین میں نہیں ہیں لیکن مذہبی قوانین کے مطابق ان کا انجام پانا ضروری ہے، ورنہ ان کا انعقاد ہی نہ ہوگا، تیسری چیز یعنی ملی روایات اور معاشرت میں مذہب کے اثرات، گو یہ بھی دین کا رکن نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود مذہب کی اصلی روح یہی ہیں اور عقیدہ کی پختگی یا ایمان کا فطری نتیجہ ہیں، جن کو مذہب سے کسی حال میں بھی الگ نہیں کیا جا سکتا، مثلاً اسلامی زندگی میں توحید، خدا پرستی اور اس پر توکل و اعتماد کے اثرات وغیرہ اور یہ اثرات اتنے متوارث ہیں کہ بے عمل مسلمانوں کی زندگی بھی ان سے یکسر خالی نہیں ہوتی، یا سچے اور با عمل مسلمانوں کی عام معاشرت میں اسوۂ رسول اور اسوۂ صحابہ کی تقلید اور اسلامی روایات کا احترام وغیرہ یہی حال دوسرے فرقوں کا بھی ہے، چوتھی چیز، عام تہذیب

معاشرت ہے، اس بارہ میں اسلام کے نقطۂ نظر معلوم کرنے کے لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے،

اسلام دین کامل اور دین وحدت ہے

اسلام اور دوسرے مذاہب میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ دنیا کے بیشتر مذاہب کو صرف خدا اور بندے کے تعلق سے بحث ہے، اس لئے ان کی تعلیم عقائد عبادات اور بعض اخلاقی باتوں تک محدود ہے، ان کو انسان کی دنیاوی زندگی سے بہت کم علاقہ ہے، اس لئے ان میں یا سرے سے دنیاوی زندگی کے قوانین ہی نہیں ہیں اور اگر ہیں بھی تو بہت ناقص، لیکن اسلام دین کامل ہے، اس لئے اس کا قانون زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، اور اس میں عقائد، عبادات، دنیاوی معاملات، حیات بعد الموت زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق خواہ وہ دنیاوی یا مادی ہو یا اخلاقی و روحانی مکمل تعلیمات اور ضابطۂ حیات موجود ہے، جس پر عمل کے بغیر اسلامی زندگی کامل نہیں ہوتی،

اسی کے ساتھ اسلام دین وحدت بھی ہے، اور اس کا مقصد مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں وحدت و یکرنگی ہے، یعنی جس طرح سارے مسلمانوں کے عقائد عبادات میں وحدت ضروری ہے، اسی طرح ان کی تہذیب و معاشرت میں بھی یکسانی ہونی چاہئے تاکہ وہ ایک ہی اصل کی شاخ اور ایک ہی درخت کا پھل نظر آئیں، گو ظاہر بین اس کو تنگدلی اور تنگ نظری پر محمول کریں گے، لیکن اگر ضبط و نظام (ڈسپلن) کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ اسلام کے کمال اور اس کی جامعیت کی دلیل ہے، اور ہر کامل مذہب کو ایسا ہی ہونا چاہئے، دنیا کا جو اجتماعی نظام جتنا منظم اور ترقی یافتہ ہوگا، اس میں تنوع کے باوجود ایک طرح کی یکرنگی پائی جائے گی، جس کا نمونہ فوج ہوتی ہے۔

اصول کی وحدت کیساتھ فروع میں وسعت و تنوع کی اجازت

لیکن اسی کے ساتھ اسلام چونکہ دین فطرت اور عالمگیر مذہب ہے، اور وہ ساری دنیا کی رہنمائی اور ابد تک کے لئے آیا تھا، اور قانون ارتقا بھی خدا ہی کا بنایا ہوا ہے، جس پر یہ روشن ہے کہ کوئی قانون خواہ کتنا ہی جامع او

مکمل کیوں نہ ہو اپنی تمام جزئیات کے ساتھ ہر زمانہ کے لئے کارآمد نہیں ہو سکتا اور زمانہ کی رفتار اور حالات کے تغیر کے ساتھ زندگی کے تقاضے اور اس کی ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں اس لئے اسلام میں وحدت و یکسانی کے تصور کے باوجود اس کے بنیادی عقائد اور ارکان کو چھوڑ کر جو اس لئے ناقابل تغیر ہیں کہ وہ زمان و مکان اور حال و مستقبل کی قید سے ماوراء ہیں اور ان سے زمانہ کی ترقی کا کوئی تصادم نہیں ہوتا، باقی بہت سے دنیاوی امور کے فقہی قوانین میں زمانہ کے حالات و ضروریات کے مطابق اسلامی اساس پر ترمیم و تبدیلی کی اجازت ہے، یہ بھی مسلم ہے کہ مختلف ملکوں کے جغرافی حالات اور ملکی و قومی خصوصیات جدا جدا ہیں جن میں ایک ہی تہذیب و معاشرت نہیں چل سکتی اور ہر قوم میں کچھ نہ کچھ اچھے اور قابل تقلید اوصاف ہوتے ہیں، اس لئے اسلام نے منہیات شرعیہ کے علاوہ مسلمانوں کے لئے کسی خاص معاشرت کی پابندی ضروری نہیں قرار دی ہے، اور دوسری قوموں کی اچھی اور مفید باتوں کے اختیار کرنے کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا کہ "الحکمة ضالة المومن اخذها اینما وجدها" یعنی حکمت اور دانائی کی باتیں مسلمانوں کا گمشدہ مال ہیں، اس کو جہاں پائیں لے لیں یہی مقصد ہے، دنیا کے کسی مذہب میں انسانیت کی صالح ترقی کیلئے اس سے بہتر تعلیم نہیں مل سکتی، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے سچے جانشینوں اور بڑے بڑے اصحاب نے دنیاوی غیر مذہبی امور میں دوسری قوموں کی مفید باتوں کو اختیار کیا ہے،

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی ارکان یعنی عقائد و عبادات اور حلال و حرام کے قوانین تو ناقابل تغیر ہیں، جن کی پابندی مسلمانوں کے لئے ضروری ہے، اس لئے کلچر کے اس حصہ میں نہ صرف مسلمان بلکہ دنیا کا کوئی فرد بھی تبدیلی نہیں کر سکتا اور وحدت کلچر کے

داعیوں نے بھی اس کو مستثنیٰ کر دیا ہے، نیم مذہبی و معاشرتی مراسم کا بھی مذہبی طریقہ پر انجام پانا ضروری ہے، اس میں بھی تغیر نہیں ہو سکتا، معاشرت میں بھی ایک حد تک مذہبی اثرات فطری ہیں جو اس سے جدا نہیں ہو سکتے، یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے کہ جس عقیدہ پر خواہ وہ دنیاوی ہی ہو پورا اذعان اور پختہ یقین ہو گا تو اس کے اثرات زندگی میں لازمی طور سے ظاہر ہوں گے، یہ اصول نہ صرف مذہب بلکہ دنیا کے ہر عقیدہ میں کارفرما ہے،

رہ گئی تہذیب و معاشرت یعنی لباس، وضع قطع، رہنے سہنے، کھانے پینے اور ملنے جلنے کے طریقے اور آداب وغیرہ تو اس میں اسلام نے محرمات شرعیہ کے علاوہ اور کوئی پابندی نہیں رکھی ہے اور ہر وہ معاشرت اختیار کی جا سکتی ہے جو اسلامی قانون کے رو سے حرام نہ ہو، مثلاً مردوں کے لئے سونے اور ریشم کا استعمال حرام ہے، لباس ساتر ہونا چاہئے، اس کے علاوہ اور کوئی پابندی نہیں ہے، کھانے میں حرام چیزیں نہ ہونی چاہئیں اور ہر حلال اور پاک چیز کھائی جا سکتی ہے، اسی طریقہ سے معاشرت کے ہر شعبہ میں ممنوعات شرعیہ کے علاوہ ہر چیز کو اختیار کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے، چنانچہ معاشرتی تنوع کا مشاہدہ آج بھی مختلف اسلامی ملکوں میں کیا جا سکتا ہے جن میں مذہبی وحدت کے علاوہ سب کی معاشرت جدا جدا ہے،

کسی تہذیب کی اشاعت و مقبولیت اور اس کے رد و قبول کے فطری اصول

لیکن کوئی تہذیب و معاشرت زبردستی نہیں منوائی جا سکتی، بلکہ اس کی اشاعت و مقبولیت اور رد و قبول کا تعلق اس کے حسن و خوبی، فوائد و ضرورت، ملکی حالات اور دوسری قوموں کے ساتھ اس کے میل جول سے ہے، جس تہذیب میں ظاہری نفاست و دلآویزی اور معنوی افادیت ہوگی وہ خود بخود پھیل جائیگی اور جن قوموں کو اس سے سابقہ ہوگا وہ خود بخود اس کو اختیار کریں گی، اور جو تہذیب ان اوصاف سے خالی ہوگی اس کو جبر سے بھی نہیں منوایا جا سکتا،

بلکہ وہ اپنی قوم سے بھی رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی، ہندوستان میں مسلمانوں اور ان کے بعد انگریزوں کے تمدن کی اشاعت کا ایک بڑا سبب اس کی ظاہری نفاست و دلآویزی تھی،

جب دو قوموں اور دو تہذیبوں کا آپس میں میل جول ہوگا تو فطری طور پر دونوں نہ صرف ایک دوسرے کی خوبیوں بلکہ برائیوں سے بھی متاثر ہوں گی، اس کی زندہ مثال ہندوستان کے مسلمان ہیں، ان میں ہندوؤں کے اثر سے شریف و رذیل کے طبقے ہو گئے جو اسلامی مساوات کے سراسر خلاف ہے، بیوہ کی دوسری شادی معیوب قرار پا گئی، حالانکہ اسلام میں اس کی تاکید ہے، اسلامی قانون میں خاص حالات میں طلاق کی اجازت ہے لیکن ہندوستانی مسلمانوں خصوصاً شرفاء میں سخت معیوب سمجھی جاتی ہے، اس لئے کہ ہندوستان میں نکاح ایک ناقابل تنسیخ رشتہ ہے، اودھ اور پنجاب میں لڑکیوں کو ان کا شرعی ترکہ نہیں ملتا، اس قسم کی اور بہت سی برائیاں جن کی اصلاح اب خود ہندو کر رہے ہیں، مسلمانوں میں ہندوؤں کے اثر سے پیدا ہو گئیں،

مسلمانوں میں ہندو کلچر کے اثرات

ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی ہندو کلچر کے اثر سے خالی نہیں ہے، پیدائش سے لے کر موت تک کے رسوم میں ہندو اثرات نمایاں ہیں، پیدائش کے سارے مراسم چھٹی، چھلا، سوہلی، ستور کے ٹوٹکے اور زچہ بچہ کے متعلق ساری رسمیں ہندوانہ ہیں، شادی میں مانجھا، منڈوا، بارات، سہرہ، بری، بدھاوا، ڈولہ، بابل، چوتھی، چالا، نیگ وغیرہ ساری رسمیں ہندوانہ ہیں، ورنہ اسلامی نکاح کا تو سیدھا سادہ طریقہ ہے، اظہار مسرت میں زیادہ سے زیادہ بچیوں کو گانے کی اجازت ہے، اور ایک دعوت ولیمہ ہے، اسی طریقہ سے موت میں تیجہ، دسواں، بیسواں، چالیسی، تماہی، چھماہی، برسی، مردہ کی ہر چیز سے چھوت، قبض روح کی جگہ چراغ جلانا وغیرہ سب ہندوستانی اثرات ہیں، مسلمانوں میں خوشی کی تقریبوں کے سارے گانے ہندی ہیں، لڑکیوں کی رخصتی کے وقت ہر شریف گھرانے میں حضرت امیر خسرو

کا بھی لگایا جاتا ہے، ان اثرات کی ہمہ گیری دیکھنا ہو تو مراثی پڑھئے جس میں اہل بیت کرام کی مخدرات عصمت مآب تک خالص ہندوستانی تہذیب و معاشرت میں نظر آتی ہیں، اور حضرت قاسم کی شادی اور ان کی شہادت کے سلسلہ کی ساری رسمیں ہندوانہ ہیں، ہولی اور بسنت کے تہوار تو غریبوں کے جھونپڑوں سے لیکر سلاطین کے ایوانوں اور صوفیہ و مشائخ کی خانقاہوں تک منائے جاتے تھے اور اب بھی منائے جاتے ہیں، ان دونوں تہواروں پر بہت سے قدیم شعراء کی نظمیں موجود ہیں، اب ہولی کا رواج تو عام طور سے ترک ہوگیا ہے، لیکن اب بھی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جن میں مذاق کا رشتہ ہوتا ہے ہولی کے موسم میں ایک دوسرے پر عبیر و گلال اڑاتے ہیں، مذاق کا رشتہ خود ہندوستانی اثر ہے، مسلمانوں میں اس کا کوئی وجود نہیں، بسنت آج بھی بزرگوں کے مزارات اور خانقاہوں میں منایا جاتا ہے، اور حضرت امیر خسرو کے بسنتی گیت قوالی کی محفلوں کو گرم کرتے ہیں، مسلمانوں کا مذہب تک ہندوانہ اثر سے محفوظ نہیں رہا، تصوف میں جو روح شریعت ہے یوگ اور ویدانت کے بہت سے طریقے رائج ہوگئے ہیں، بزرگان دین کے عرسوں کے سارے مراسم غسل، گاگر، صندل، چراغاں، چادر، قوالی سب کے سب ہندو اثرات ہیں بعض مبلغ صوفیائے کرام کے ذریعہ جوش تبلیغ میں عام ہندوؤں کو مانوس کرنے کے لئے ان کی بہت سی رسمیں خانقاہوں میں داخل ہوگئیں، مسلمانوں میں ہندی زبان کی اشاعت میں ان کو بڑا دخل ہے، آج بھی ہندی کے گیت قوالی کی محفلوں کو گرم کرتے ہیں، ہندوؤں کے تقریباً سارے ٹونے ٹوٹکے اور شگون اور بدشگونی مسلمانوں میں رائج ہیں، ان کے جواز و عدم جواز سے بحث نہیں ہے، بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی ہندوانہ اثرات سے خالی نہیں ہے، یہ صرف چند سرسری مثالیں لکھ دی گئیں، اس کی تفصیل کے لئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے، اور اس سے ہر شخص واقف ہے، اسلئے مزید تفصیل کی ضرورت نہیں،

یہ اثر بالکل فطری ہے

اور یہ اثر بالکل فطری تھا، ایک ہزار سال سے ہندو مسلمانوں کا ساتھ ہے، اور مسلمان اپنی حکومت کے زمانہ میں بھی انگریزوں کی طرح اجنبی حکمراں کی حیثیت سے ہندوستان میں نہیں رہے، بلکہ انھوں نے اس کو اپنا وطن بنالیا، اور یہیں شادی بیاہ کرکے بالکل مل جل گئے، اس کے علاوہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی تعداد ہندی الاصل ہے، جن کے اسلاف نے کسی زمانہ میں اسلام قبول کیا تھا، اس لئے ان کا دین تو اسلام ہوگیا، لیکن معاشرت وہی پرانی باقی رہی، چنانچہ دیہات کے ہندو مسلمانوں میں آج بھی مذہب کے علاوہ تہذیب و معاشرت کا کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ ان مسلمانوں کا بڑا طبقہ ایسا ہے جس میں ختنہ اور گوشت خوری کے علاوہ اسلام کی اور کوئی نشانی نہیں ہے، بلکہ بہتوں میں یہ بھی نہیں ہے، تمدن زیادہ تر عورتوں کے ذریعہ پھیلتا ہے، جس گھر میں جس قوم کی عورت ہوگی اس میں اسی کے تمدن کا غلبہ ہوگا، ہندوستان میں جو مسلمان گھرانے باہر سے بھی آئے ان میں سے اکثروں نے ہندوستانی عورتوں سے شادیاں کیں، ان کے ذریعہ ہندو تمدن مسلمان گھروں میں پہنچ گیا، خصوصاً تیموری بادشاہوں نے تو راجپوت خاندانوں میں بکثرت رشتے قائم کئے، چنانچہ بہت سے تیموری سلاطین ہندو عورتوں کے بطن سے تھے، یہ عورتیں اپنا تمدن بھی ساتھ لائیں، اور خود ان بادشاہوں نے ان کی دلجوئی اور ان کو مانوس کرنے کیلئے ان کی بہت سی رسمیں اختیار کرلیں، اور ان کے پوجا پاٹ تک کا انتظام کردیا، اس طرح ہندو تمدن شاہی محلات میں پہنچ گیا، اور پھر "الناس علی دین ملوکھم" کے اصول پر حکومت کے امراء و اعیان اور سارے اونچے طبقہ میں پھیل گیا، جس سے علماء و مشائخ کے گھرانے بھی محفوظ نہ رہ سکے، اس طرح دیہات سے لیکر شہروں تک اور عوام و جہلا سے لیکر امراء و عمائد تک ہندو تمدن عام ہوگیا، اکبری دور کی ہندوئیت تو مشہور عام ہے، اورنگ زیب جیسے بادشاہ کا زمانہ بھی ان اثرات سے خالی نہیں، بلکہ بعد میں اور زیادہ اثرات بڑھتے گئے، تاریخی بحث میں

پڑنے کا یہ موقع نہیں ہے، اس حقیقت سے ہر صاحب علم واقف ہے،

ہندوؤں میں اسلامی کلچر کے اثرات

اسی کے ساتھ ہندو بھی اسلامی اثرات سے محفوظ نہ رہے، اولاً حاکم قوم کے تمدن کو محکوم قوم خود فخریہ اختیار کرتی ہے، خصوصاً جب اس میں ظاہری نفاست اور دلآویزی اور معنوی افادیت بھی ہو، تو اس کی مقبولیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، اس لئے ہندو بھی اسلامی اثر سے متاثر ہوئے، اور اس سے ان کی مذہبی و معاشرتی اصلاح میں ان کو بڑا فائدہ پہنچا، چنانچہ ہندوستان میں توحید خالص کا تصور مسلمانوں کے ذریعہ آیا، سکھ پنتھ، آریہ سماج، برہمو سماج سب اسی کے نتائج ہیں، معاشرت میں ستی کی رسم کا انسداد، عقد بیوگان، لڑکیوں کی وراثت، طلاق، اچھوت ادھار اور دوسری اصلاحات سب اسلامی اثرات ہیں، ورنہ ہندو شاستر کی رو سے یہ تمام اصلاحات ہندو مذہب کے سراسر خلاف ہیں، اسی طریقہ سے معاشرت کے ہر شعبہ میں ہندو اسلامی اثر سے متاثر ہوئے،

ہندو مسلمانوں کا مشترکہ تمدن

ان دونوں تمدنوں کے اختلاط اور ایک دوسرے کی اثر پذیری سے ایک نیا مشترک اور دلآویز تمدن پیدا ہوا، جو نہ خالص اسلامی یعنی عربی اور ایرانی ہے اور نہ شدھ ہندو، بلکہ ان سب کا عطر اور دلفریب گنگا جمنی مرقع ہے، انگریزی عہد میں اس میں یورپین تمدن کے اثرات بھی شامل ہو گئے، اور اب یہی سہ آتشہ تمدن ہندو مسلمانوں کا مشترکہ تمدن ہے، جو زندگی کے ہر شعبہ میں جاری و ساری ہے،

ہمارے لباس میں کرتہ پائجامہ، قمیص، شیروانی، انگرکھا، ہندوستانی کوٹ، دو پلڑی یا کشتی نما ٹوپی، سلیم شاہی یا انگریزی جوتا جو شہری تعلیم یافتہ طبقہ کا عام لباس ہے، نہ قدیم ہندو کا لباس ہے اور نہ عربی و ایرانی ہے، اور کسی اسلامی ملک میں نہیں پایا جاتا، بلکہ خالص ہندوستانی ہے، اب انگریزی لباس بھی ہندوستانی ہو گیا ہے، اسی طریقہ سے روزانہ کی عام غذا میں

گوشت کے علاوہ ترکاری، دال، چپاتی، چاول، چار چٹنی، چپاتی یا پوری، سہالی، مٹھائیوں کی بیشتر قسمیں سب ہندوستانی ہیں، بلکہ ہندوؤں کے بعض طبقے ہمیشہ سے گوشت کھاتے ہیں، اس لئے وہ بھی مسلمانوں کی مخصوص غذا نہیں ہے، البتہ مسلمانوں کے پرتکلف کھانے ایرانی ہیں، لیکن اب وہ بھی خالص ایرانی نہیں رہ گئے ہیں، اور موجودہ شکل میں وہ ہندوستان کے علاوہ اور کسی اسلامی ملک میں نہیں پائے جاتے، مسلمانوں نے ان کے اجزاء اور پکانے کے طریقہ میں ترقی دیکر ان کو ہندوستانی بنالیا ہے، اور یہ اتنے لذیذ ہیں کہ ہندو بھی ان کو مزے لے لے کر کھاتے ہیں، اور جن کے منہ لگ جاتے ہیں پھر نہیں چھوٹتے، حتی کہ وہ گوشت کی کوئی قسم بھی نہیں چھوڑتے، اور اب یہ کھانے عام طور سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خوشحال ہندو گھرانوں میں رائج ہیں، حتی کہ وہ بھگت بھی جو پلیٹ فارم پر ہندو مذہب اور ہندو تمدن کا پرچار کرتے ہیں، چھپ چھپ کر ان کو کھاتے ہیں، ع چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

دونوں کے رہنے سہنے کے طریقے اور ملنے جلنے کے آداب بھی یکساں ہیں، مکانات، ان کے سازو سامان اور طرز و آرائش میں بھی کوئی فرق نہیں ہے، دونوں کی ظاہری وضع قطع اب اتنی یکساں ہو گئی ہے کہ آج کے بہت سے ہندو مسلمانوں کو ظاہری لباس اور وضع قطع سے پہچاننا مشکل ہے، غرض دیہات سے لیکر شہر تک ہندو مسلمانوں کی عام معاشرت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، لیکن معاشرت میں اس عمومی اشتراک کے باوجود اس کلچر میں ہندو مسلمانوں کی مذہبی خصوصیات اور ان کی قومی و ملی روایات بھی موجود ہیں، جس سے دونوں کی امتیازی حیثیت بھی قائم ہے، اس حیثیت سے ہندو مسلم کلچر کا ایک پہلو علٰحدہ بھی ہے لیکن تہذیب و معاشرت کے عمومی اشتراک پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا،

کیا ہندوستان کے مسلمانوں کا کلچر خالص اسلامی ہے

اس موقع پر ایک عام غلط فہمی کا ازالہ

ضروری ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کو ہندوستان سے اجنبیت کا طعنہ دیا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اسلامی کلچر بیرونی ہے، اور مسلمانوں کی نگاہ ہمیشہ عرب اور ایران و توران پر لگی رہتی ہے، درحقیقت ہندوستان میں جس کلچر کو اسلامی کہا جاتا ہے وہ خالص اسلامی نہیں بلکہ عربی آمیز عجمی ہے، جس میں اب ہندو کلچر کے اثرات بھی شامل ہوگئے ہیں، اسلامی کلچر تو نہایت سادہ ہے، اس میں یہ تکلفات کہاں، بلکہ تکلفات تو اسلامی روح کے منافی ہیں، اس کے اسلامی کہلانے کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ایرانی اور عربی تمدن کا میل بہت ابتدا میں ہو گیا تھا، لیکن اموی حکومت کے زمانہ تک بڑی حد تک عربی تمدن قائم رہا، ان کے بعد عباسی خلفاء نے مختلف اسباب وحالات کی بناء پر ایرانی تمدن اختیار کر لیا، لیکن وہ حاکم تھے اور ان کا مذہب اسلام تھا اس لئے عجمی تمدن پر بھی گہرے اسلامی اثرات پڑے، اور جس طرح ہندوستان میں ایرانی عربی اور ہندو تمدن سے مل کر ایک مشترک تمدن پیدا ہوا اسی طرح عباسی دور میں ایرانی اور عربی تمدن کی آمیزش سے مشترک تمدن پیدا ہوا تھا، اور عباسی خلافت کو ساری دنیائے اسلام میں مذہبی مرکزیت حاصل تھی، اس لئے اس کا تمدن اسلامی کہلایا،

دوسرا سبب یہ ہوا کہ ہندوستان میں اس تمدن کے لانے والے سلاطین مسلمان تھے، اس لئے ان کا تمدن بھی اسلامی کہلایا، حالانکہ وہ نسلاً اور وطناً ایرانی، تورانی، مغل، پٹھان اور ترک تھے، اور گو ان کا مذہب اسلام تھا، لیکن ان کا تمدن اپنا قومی اور ملکی تھا، اسی لئے اس تمدن میں اسلامی کے مقابلہ میں عجمی اثرات زیادہ ہیں، اور یہ تمدن مسلمانوں کے لئے مذہبی نقطہ نظر سے وہی حیثیت رکھتا ہے جو مشترک ہندوستانی تمدن کی ہے، اس لئے ہندوستان کا اسلامی تمدن درحقیقت اسلامی نہیں بلکہ عربی آمیز عجمی ہے، اور جیحوں سیحوں، شیریں فرہاد اور رستم سہراب کو نہ عرب سے کوئی تعلق ہے، اور نہ اسلام سے مسلمانوں کیلئے ان کی وہی حیثیت ہے،

جو گنگا جمنا، نل دمن اور بھیم و ارجن کی ہے، ہندوستان کے مسلمانوں میں ایرانی و تورانی روایات اس لئے پھیلیں کہ یہاں کے مسلمان بادشاہ ایرانی و تورانی تھے، جو اپنی قومی و ملکی روایات اپنے ساتھ لائے تھے، اور یہ چیزیں ہندوستان میں اسلام کے وسیلہ سے نہیں آئیں، چنانچہ آج بھی عربی ممالک میں ان کا کہیں وجود نہیں ہے، مسلمانوں کا مذہبی تعلق صرف عرب سے ہے، وہ ان کا مذہبی مرکز ہے، کاش ان کا تمدن خالص عربی اور اسلامی ہوتا تو ان کو یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا، رونا تو یہی ہے کہ ان کو اسلام کے ساتھ نسبت کے علاوہ بہت کم علاقہ رہ گیا ہے،

ہندوستان میں تو اسلام بھی اپنی اصل شکل میں نہیں آیا، ورنہ آج اس کی تاریخ کچھ اور ہوتی، اس میں تو اتنی کشش ہے کہ جن ملکوں میں وہ اپنی شکل میں پہنچا، ان کی کایا پلٹ گئی، اور ان کا نہ صرف مذہب بلکہ پورا کلچر بدل گیا، آج بھی وہ سارے ملک جن میں اسلام عربوں کے ذریعہ پہنچا الحمد للہ اسلامی ہیں،

کیا ہندوستان کا کلچر کبھی ایک رہا ہے

آخر میں یہ بحث باقی رہ جاتی ہے کہ کیا کبھی پورے ہندوستان کا کلچر ایک رہا ہے، اور کیا آج بھی ایک ہے، اس میں تو ہندوستان کا حال دنیا کے تمام دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے، دنیا کی ہر قوم کے مختلف فرقوں اور طبقوں میں کچھ نہ کچھ بنیادی باتیں ضرور مشترک ہوتی ہیں، لیکن ہندوؤں میں تو یہ وحدت بھی نہیں ہے، اور ان کے مختلف فرقوں میں بنیادی اختلاف بلکہ تضاد ہے، سناتن دھرم برہمنی مذہب ہے، وہ مورتی پوجا کا قائل ہے، اور اس کا نظام معاشرت طبقات کی تقسیم پر قائم ہے، اصلی بدھ مذہب بت پرستی اور طبقاتی تقسیم دونوں کے خلاف ہے، لیکن اس میں خدا کا کوئی تصور نہیں ہے، بلکہ وہ خود انسان میں نروان کی صلاحیت مانتا ہے، لیکن اب اس میں بھی بت پرستی رائج ہو گئی ہے، جینی مذہب میں بھی خدا کا کوئی تصور نہیں ہے، آریہ بت شکن

ہیں، سکھوں کا مذہب گو ہندو نہیں ہے لیکن ہندوستان ہی کا پیدا شدہ ہے، اور اس کی اصل بنیاد توحید و روحانیت پر ہے، گو اب اس میں بھی بیرونی اثرات شامل ہو گئے ہیں جو زیادہ تر عیسائیت اور کچھ اسلام اور ہندو مذہب سے ماخوذ ہے،

ان کے مختلف طبقوں اور فرقوں کے دیوتا اور مندر الگ الگ ہیں، اچھوتوں کو مندروں میں داخلہ اور ہندوؤں کی مقدس کتابوں کی تلاوت اور ان کے چھونے کی بھی اجازت نہیں ہے، برہمن ان کے سایہ سے بھاگتے ہیں، ان میں شادی بیاہ قانوناً ناجائز ہے، ایک گائے کی تقدیس البتہ سب فرقوں میں مشترک ہے، لیکن چمار مردہ گائے کا گوشت تک کھا جاتے ہیں، سب کی شادی بیاہ کی رسمیں جدا ہیں، بلکہ خود شدروں کی مختلف برادریوں کی یہ رسمیں بھی جدا جدا ہیں، یہ تو مذہب کے اختلاف کا حال ہے تہذیب و معاشرت میں اس سے بھی ..... زیادہ اختلافات ہیں، شمالی ہند کا کلچر جنوبی ہند سے کشمیر کا آسام سے بنگال کا پنجاب سے مدراس کا یوپی اور بہار سے اسی طریقہ سے ہندوستان کے مختلف صوبوں کا کلچر باہم اتنا مختلف ہے کہ ان کے باشندے ایک دوسرے کی زبان تک نہیں سمجھ سکتے بلکہ خود ایک صوبہ کے ہندوؤں کے مختلف طبقوں کا کلچر یکساں نہیں ہے، اس لئے پورے ہندوستان کا کلچر کبھی ایک تھا اور نہ اب ہے، مسلمانوں کو ان مختلف کلچروں میں سے کس کلچر کے اختیار کرنے کی دعوت دی جاتی ہے، اور وہ ہندوؤں کے کس فرقہ، کس طبقہ اور کس صوبہ کا کلچر اختیار کریں، درحقیقت اگر کوئی مشترک کلچر کہا جا سکتا ہے تو وہی ہے جو اسلامی اور ہندو کلچر سے مل کر بنا ہے، اور اب اس میں یورپین تمدن کے اجزاء بھی شامل ہو گئے ہیں، یہ کلچر پنجاب سے لیکر بہار تک رائج اور ہر صوبہ میں کم و بیش پایا جاتا ہے،

کیا قدیم ہندو تمدن کا احیا مفید ہے اور وہ اس زمانہ میں چل سکتا ہے

البتہ اگر وحدت کلچر سے یہ

مقصد ہے کہ ہندوستان کے ہزاروں سال پرانے تمدن کو پھر سے زندہ کیا جائے تو گو وہ بھی ایک نہیں ہے تاہم اگر اس میں کسی نوع کی وحدت مان بھی لی جائے تو وہ اس ترقی یافتہ دور میں قطعاً نہیں چل سکتا اور نہ ہندوستان اس کے بل پر زندہ رہ سکتا ہے، اور عالم خیال کے علاوہ عملاً اس کا زندہ کرنا ناممکن ہے حتیٰ کہ اس تمدن کے نقیب بھی اس پر عمل نہیں کر سکتے، اور اس کا تصور ہی بے معنی ہے،

کوئی پڑھا لکھا شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ تمدن ایک ارتقا پذیر چیز ہے، اور ابتدائے آفرینش سے اب تک اس میں ارتقاء کا عمل برابر جاری ہے، جس سے دنیا کا کوئی تمدن بھی مستثنیٰ نہیں، پرانے تمدنوں کو لغو اور بے کار نہیں کہا جا سکتا، وہ سلسلۂ ارتقا کی ایک کڑی اور اپنے زمانہ کے لئے موزوں تھے، لیکن آج وہ بجنسہٖ نہیں چل سکتے اسلئے جو قوم بھی اپنے پرانے تمدن پر جمی رہے گی اور تمدنی ارتقا کا ساتھ نہ دے گی وہ یا تو ختم ہو جائیگی یا اس کا شمار پس ماندہ قوموں میں ہوگا، اور وہ ترقی یافتہ قوموں کی ہمسری نہ کر سکے گی، اس سے انکار نہیں کہ ہر مذہب و ملت کے کلچر میں بعض ایسے بنیادی ارکان ہوتے ہیں، جو کبھی نہیں بدل سکتے، اور جن پر اسی قوم کے وجود اور اس کی امتیازی حیثیت کا مدار ہوتا ہے، لیکن ان کے علاوہ زندگی کے اور شعبوں میں اگر صالح بیرونی اثرات نہ قبول کئے جائیں، تو کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، اس لئے ہندوؤں کا پرانا تمدن خواہ اس زمانہ کے ہندوستان کے لئے کتنا ہی موزوں رہا ہو لیکن اس زمانہ میں وہ نہیں چل سکتا، اور آج خود ہندو قوم زمانہ کے حالات کے مطابق ہر شعبہ میں اصلاح و تغیر کرنے پر مجبور ہے، جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، اس کی تازہ مثال ہندو کوڈ بل ہے، اور جس قدر زمانہ ترقی کرتا جائے گا، ہندوؤں کا پرانا نظام بدلتا جائے گا،

ہندوستان میں شخصی زندگی سے لیکر نظام حکومت تک سب بیرونی تمدن پر قائم ہے

ہندوستان کی جاہل دیہاتی آبادی کو چھوڑ کر تعلیم یافتہ شہری طبقہ کی تہذیب و معاشرت میں جو کلچر کا اصلی نمایندہ ہوتا ہے، چند مذہبی اثرات کے علاوہ پرانی ہندو تہذیب کا کونسا اثر باقی ہے؟ اس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، آج بڑے سے بڑے فرقہ پرست اور ہندو کلچر کے مبلغ اور نقیبوں کی زندگی میں بھی پرانے ہندو کلچر کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا، بڑے بڑے کانگریسی نیتا وزرا اور عمال کوٹھیوں میں رہتے، موٹروں پر نکلتے، ہوائی جہازوں میں اڑتے اور ٹیلی فون سے بات کرتے ہیں، سب کی کوٹھیوں میں دیئے کے بجائے بلب جلتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی ننگے بدن چوکے میں بیٹھ کر پترے میں نہیں کھاتا، ان کی میزوں پر انواع و اقسام کے کھانے ہوتے ہیں،

غرض مخصوص مذہبی مراسم اور بعض پرانی قومی و ملکی روایات کے علاوہ ان کی تہذیب و معاشرت میں خالص پرانے ہندو تمدن کا کوئی اثر باقی نہیں ہے، یہ تو معاشرت کا حال ہے، حکومت اور سیاست پر نگاہ ڈالی جائے تو اس کا پورا ڈھانچہ ہی بدلا ہوا ہے، اس کے آئین و قوانین اور حکومت کے سارے شعبے اور عہدے سب انگریزی نظام کی نقل ہیں، آزاد ہندوستان کے دستور میں کوئی دفعہ بھی تو ہندو شاستر کی نہیں ہے، پارلیمنٹ اور کونسلوں و اسمبلیوں کے ایوان، سکریٹریٹ کے دفاتر، گورنر جنرل اور وزیر اعظم سے لیکر پولیس کی چوکیوں اور دیہات کے چوکیداروں تک حکومت کا سارا نظام، اس کے کل شعبے اور عہدے سب کے سب انگریزی ہیں، صنعت و حرفت، تجارت کے بڑے بڑے کارخانے، ان کی مشینیں، ان کا نظام، ریل، جہاز، ہوائی جہاز، ٹیلی گراف، ٹیلی فون، ریڈیو وائرلیس، سارے آلات و اسلحہ، غرض حکومت کے سارے اجزا، اور ملک کی ترقی کے سارے وسائل، اور جملہ سرو سامان میں

کوئی چیز بھی تو پراچین بھارت کی نہیں، سب یہ ماڈرن یورپ کی نقل و تقلید ہے، پھر آخر وہ کونسا شعبہ ہے جس میں پرانے ہندو تمدن کی تجدید ہوگی، اور وہ کون سے اجزا ہیں جن کے قبول کرنے کی دعوت دیجاتی ہے،

مشترک تہذیب اور اس کے آثار ہندوستان کی عظمت کا نشان اور اس کی آبرو ہیں

لیکن اگر اجنبی اور بیرونی تمدن سے مراد صرف اسلامی عہد کے اثرات ہیں تو اس کا مٹانا بھی ناممکن ہے، زندگی کا کوئی شعبہ بھی تو ان سے خالی نہیں ہے، یہ اثرات تو ہندوستانی تہذیب کے رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوئے ہیں، ان کو مٹانا گوشت کو ناخن سے جدا کرنا ہے، ہندوستان کی ساری عظمت و شان اور حسن و دلآویزی اسی گنگا جمنی سنگم سے قائم ہے، اس کا جو نقش بھی مٹے گا اس سے تنہا اسلامی عہد کا نشان نہیں بلکہ ہندوستانی تمدن کا ایک دلفریب رخ مٹ جائے گا، اگر تاج محل، دلی اور آگرہ کے قلعے، فتح پور سیکری کی عمارتیں...... کشمیر کا شالامار باغ اور اسلامی عہد کے دوسرے آثار مٹا دیے جائیں، تو ہندوستان کا حسن غارت ہو جائے گا، یہ عمارتیں محض اینٹ اور پتھر کا تودہ نہیں بلکہ ہندو مسلم آرٹ کا شاہ کار ہیں جس میں دونوں کلچروں کی روح جھلکتی ہے، اور اس روح سے دلی کی جامع مسجد، آگرہ کی موتی مسجد، امرتسر کا گولڈن ٹمپل اور اسلامی عہد کے تعمیر شدہ مندر بھی خالی نہیں ہیں، یہی روح اور یہی آرٹ ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے ہر شعبہ میں موجود ہے، اس کے مٹانے کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستانی تہذیب کا آرٹ اور حسن مٹ جائے گا،

کشمیر کی شال، نمدے، چاندی اور لکڑی کا کام، بنارس کی زردوزی، قالین بافی، پیتل کی نقاشی، ٹانڈہ کی جامدانی، مراد آباد کے برتن، حیدرآباد کا ٹمرو اور بدری اور لکھنؤ کا چکن اور سادہ کاری کے کام اور اس قسم کی سیکڑوں صنعتیں جیشتر اسلامی عہد کی یادگار ہیں، اور آج بھی ان کے

کاریگر مسلمان ہیں، کیا ان کو مٹانے سے ہندوستان کا نقصان نہ ہوگا، اس لئے جو لوگ اسلامی عہد کے آثار کو مٹانا چاہتے ہیں وہ ہندوستان کے دوست نہیں بلکہ دشمن ہیں،

نتیجہ بحث | اس بحث کا مقصد اور خلاصہ یہ ہے، کہ سارے ہندوستان کا کلچر کسی زمانہ میں بھی ایک نہیں رہا، اگر کوئی مشترک کلچر کہا جا سکتا ہے تو وہ وہی ہے جو ہندو مسلمانوں کے صدیوں کے میل جول سے پیدا ہوا، اور جس میں ان دونوں کے مساوی تمدنی اثرات ہیں، اور اس اشتراک کے باوجود دونوں کی امتیازی حیثیتیں بھی قائم ہیں، ہندوستانی تمدن کا سارا حسن وجمال اور اس کی عظمت و شان اسی تمدن سے وابستہ ہے، اور وہ ہندوستان کی رگوں میں خون کی طرح جاری ہے اس کو مٹانے کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کی روح نکال لی جائے،

اس زمانہ میں ہزاروں سال پرانے ہندو تمدن کو زندہ کرنے کا تخیل نہ صرف بے معنی بلکہ عملاً بھی ناممکن ہے، ہندوستان اپنے پورے وجود میں بیرونی اثرات کی نقل و تقلید پر مجبور ہے اور ہندو تمدن کے نعرہ کے باوجود آج بھی اشخاص کی زندگی سے لیکر حکومت کے نظام تک کوئی چیز بھی بیرونی اثر سے خالی نہیں ہے، اس لئے یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، یہ تصور قومی وحدت اور ملکی ترقی دونوں کے خلاف ہے، اور اس سے قومی تفریق اور ملکی تخریب کے سوا کچھ حاصل نہیں ہے، اس لئے ہندو و مسلمان دونوں کو اپنی مذہبی و ملی خصوصیات قائم رکھتے ہوئے مشترک تمدن کو نہ صرف قائم رکھنا بلکہ اس کو فروغ دینا چاہیئے، اسی میں ہندوستان کی فلاح ہے، یہ تمدن درحقیقت "بھارتیہ مندر" ہے جس کا احترام دونوں کیلئے ضروری ہے،

(۰:۰)

عہد اسلامی کا ہندوستان

ملوک سلاطین دہلی

از

مولانا سید ریاست علی ندوی

(۳)

علماء | امام رضی الدین حسن بن محمد صغانی اس دور کے ان مشاہیر اہل علم میں سے ہیں جن پر عالم اسلام کو ناز تھا، وہ ۵۵۷ھ (۱۱۶۲ء) میں لاہور میں پیدا ہوئے یہیں نشوونما پائی، اپنے والد شیخ محمد بن حسن صغانی سے علوم کی تحصیل کی، اور ارباب فضل میں شمار کئے گئے، سلطان قطب الدین ایبک نے لاہور کی قضاءت پیش کی، مگر علوم کی تکمیل پیش نظر تھی، عہدہ قبول نہیں کیا، لاہور سے غزنی گئے، کچھ دنوں وہاں درس و تدریس کی خدمت انجام دی، پھر اس دور میں عالم اسلام میں علم و فن کے جو اہم مرکز تھے، اور جہاں ممتاز شیوخ علم نے اپنی مسند درس بچھائی تھی وہاں پہنچے اور علم و عرفان کی دولت سے مالا مال ہوئے، ۶۱۵ھ (۱۲۱۸ء) میں خلیفہ الناصر لدین اللہ عباسی نے خلعت سے نوازا، اور ۶۱۷ھ (۱۲۲۰ء) میں فرمان دے کر سلطان شمس الدین التمش کی خدمت میں بھیجا، اور یہیں دار السلطنت دہلی میں بود و باش اختیار کر لی، ۷ برس کے قیام کے بعد ۶۲۴ھ (۱۲۲۷ء) میں وہ حج کے لئے روانہ ہوئے، اور عالم اسلام میں علوم کی خدمت انجام دیتے رہے، اس کے بعد خلیفہ المستنصر عباسی نے سلطانہ رضیہ کے پاس ہندوستان سفیر بنا کر بھیجا، اور یہاں دوبارہ

قیام فرما رہے، اس کے بعد ۶۳۷ھ/۱۲۳۹ء میں پھر بغداد تشریف لے گئے، اور وہیں وفات پائی، اور ابتداءً وہیں مدفون ہوئے، پھر وصیت کے مطابق لاش مکہ معظمہ لے جائی گئی، اور وہی ان کی ابدی خواب گاہ بنا،

علامہ صغانی علوم حدیث، فقہ اور لغت کے امام تھے، عالم اسلام کے جلیل القدر علماء و مصنفین نے ان علوم میں ان کے علو مرتبت کا عقیدت کے ساتھ اعتراف کیا ہے، شیخ شرف الدین دمیاطی، محمود بن عمر ہروی، ابن صباغ، برہان الدین محمود بن اسعد بلخی وغیرہ ان کے ممتاز تلامذہ میں سے ہیں، انھی علوم میں ان کی بہت سی گراں قدر تصنیفات ہیں، علم حدیث میں ان کی شہرۂ آفاق تصنیف مشارق الانوار کی ضیا پاشیوں سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں علم حدیث کی روشنی پہنچی، عالم اسلام کے ممتاز اہل علم نے اس کی بکثرت شرحیں لکھیں، جن کا تذکرہ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں کیا ہے، حدیث میں ان کی دوسری تصنیف مصباح الدجی فی حدیث المصطفیٰ اور الشمس المنیرہ وغیرہ ہیں، اسی طرح فن لغت میں العباب، الذخر، مجمع البحرین، النوادر فی اللغۃ و التراکیب وغیرہ کو عام شہرت حاصل ہے، اسی طرح حدیث، فقہ اور لغت میں ان کی دیگر تصنیفات ہیں۔[1]

مولانا شہاب الدین بدایونی اس عہد کے ممتاز افاضل میں تھے، امیر خسرو نے ان کی شان میں قصائد لکھے ہیں، شیخ ضیاء الدین نخشبی ان کے تلامذہ میں سے تھے، شیخ اسحٰق بن علی بخاری اس عہد کے ممتاز اہل صوفیہ میں سے تھے، وہ شیخ منہاج الدین علی بن اسحاق بخاری کے صاحبزادے تھے، دہلی میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی، مدرسہ معزیہ میں ایک مدت تک درس و تدریس کی خدمت انجام دی، شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ سے بیعت کی، انھوں نے خرقۂ خلافت

[1] نزہۃ الخواطر ص ۱۳۷۔

بھی عطا کیا، مختلف علوم میں دستگاہ رکھتے تھے، "اسرار الاولیا" کے نام سے اپنے شیخ کے ملفوظات جمع کئے تھے، علم صرف میں ایک منظوم رسالہ بھی لکھا، ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء میں وفات پائی۔[1]

علامہ برہان الدین محمود بن ابو الخیر اسعد بلخی اپنے دور کے افاضل روزگار میں سے تھے، کہا جاتا ہے کہ نحو، لغت، فقہ، حدیث اور علوم عقلی میں ان کے زمانہ میں ہندوستان میں ان سے بڑا عالم کوئی دوسرا نہ تھا، فقہ کی تحصیل ہدایہ کے مصنف شیخ برہان الدین مرغینانی سے کی، حدیث امام صغانی صاحب مشارق الانوار سے پڑھی، اسی کے بعد ہندوستان وارد ہوئے اور غیر معمولی عزت و اکرام سے ان کی پذیرائی ہوئی، سلطان غیاث الدین ان کا احترام کرتا اور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض اٹھاتا تھا، ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء میں وفات پائی، دہلی میں حوض شمسی کے قریب دفن کئے گئے۔[2]

علامہ نجم الدین عبد العزیز بن محمد دمشقی دہلوی علوم عقلیہ کے ماہرین میں سے تھے، امام فخر الدین رازی سے علوم کی تحصیل کی، اس کے بعد ہندوستان وارد ہوئے، اور یہاں کے ملوک و امراء نے ان کے ورود کو مغتنم سمجھا، سلطان غیاث الدین ہر ہفتہ ان کی خدمت میں آتا، اور ان کی صحبت سے حظ اٹھاتا تھا۔[3]

مولانا شمس الدین خوارزمی سلطان غیاث الدین کے عہد کے ممتاز اساتذہ میں سے تھے، سلطان نے شمس الملک کا لقب عطا کیا، حضرت نظام الدین اولیاء، قطب الدین ناقلہ اور شیخ برہان الدین عبد الباقی وغیرہ جیسے اکابر ان کے تلامذہ میں سے تھے۔[4]

مولانا برہان الدین بزاز حنفی دہلوی دہلی کے ممتاز فقہا میں سے تھے، درس و تدریس کا مشغلہ جاری تھا، غیاث الدین بلبن عزت و اکرام سے پیش آتا تھا۔[5]

[1] نزہۃ الخواطر ص ۱۴۴، [2] ایضاً ص ۱۴۲، [3] ایضاً ۱۳۲، [4] ایضاً ۱۶۲، [5] ایضاً ص ۱۲۸۔

مولانا برہان الدین نسفی بھی دہلی کے فقہا میں تھے، مسند درس بچھی ہوئی تھی، جب کوئی طالب علم آتا تو اس سے تین باتوں کا اقرار لیتے تھے اول یہ کہ شب و روز میں صرف ایک مرتبہ کھائے گا، درس میں کسی دن بھی تاخیر سے نہ پہنچے گا، اگر اس کے خلاف ہوا تو پھر اس کو کبھی درس میں بیٹھنے کا حق نہ ہوگا، تیسرے یہ کہ اثنائے راہ میں بجز سلام مسنون کے تعظیم کا کوئی اور طریقہ ان کے ساتھ اختیار نہیں کرے گا، بڑے بڑے علماء و مشائخ ان کے حلقہ درس سے فیضیاب ہوئے[1]،

حکیم حسام الدین ماریکلی عہد بلبن میں دار السلطنت کے ممتاز اطباء میں سے تھے، درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری تھا[2]،

شیخ ابوبکر بن یوسف سجزی دہلی کے ممتاز اساتذہ میں سے تھے، غیاث الدین بلبن بڑی عزت کرتا اور ہر جمعہ کو نماز کے بعد ان کی مجلس میں حاضر ہوتا تھا[3]،

سید صدر الدین محمد بن محمد سندھی اپنے عہد کے ممتاز علماء میں تھے، ۶۶۹ھ / ۱۲۷۰ء میں وفات پائی بھکر میں مدفون ہوئے[4]،

اسی طرح اس دور کے ممتاز علماء، فقہا، محدثین میں شیخ کمال الدین احمد دھمینی محدث متوفی ۶۷۱ھ / ۱۲۷۲ء قاضی رفیع الدین گاذرونی فقیہ (نزہۃ الخواطر ۱۵) قاضی رکن الدین سامانی فقیہ (ص ۵۵) مولانا زین الدین بدایونی (ص ۱۶۰) مولانا سراج الدین ترمذی (ص ۱۶۱) مولانا سدید الدین دہلوی فقیہ (ص ۱۰۱) قاضی کمال الدین جعفری صاحب کتاب المغنی فی الفقہ (۱۰۲) مولانا شرف الدین والوالجی فقیہ (ص ۱۶۳) قاضی ظہیر الدین دہلوی فقیہ، (۱۸۱) شیخ مجد الدین بن ظہیر الدین لاہوری صاحب تصانیف مشہورہ (ص ۲۰۲) شیخ نجیب

---

[1] نزہۃ الخواطر ص ۱۲۰، [2] ایضاً ۱۴۴، [3] ایضاً ۱۲۱، [4] ایضاً ۲۲۷

ابن احمد مہروانی متوفی ۶۵۵ھ / ۱۲۵۷ء (ص ۲۳۹) وغیرہ تھے جنہوں نے اپنے زمانہ میں اپنی اپنی مسند درس بچھائی تھی، اور ان کے وجود سے علم کا عام فیض جاری تھا،

مشائخ اس دور کو اکابر مشائخ میں سے حضرت خواجہ فرید الدین مسعود بن سلیمان اجودھنی معروف بہ گنج شکرؒ کے وجود گرامی سے شرف حاصل تھا، وہ حضرت خواجہ بختیار کاکی علیہ الرحمہ کے اجل خلفاء میں سے تھے، ضلع ملتان کے قصبہ کھتوال میں پیدا ہوئے، یہیں نشو و نما پائی، اور ملتان میں تعلیم کی تکمیل فرمائی، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی سے فیض یاب ہوئے، یہیں حضرت بختیار کاکیؒ سے شرف نیاز حاصل ہوا، مزید تعلیم کی ہدایت پاکر قندھار، سیستان، بدخشاں اور بغداد تشریف لے گئے، حضرت شہاب الدین سہروردیؒ، شیخ سیف الدین باخرزی، شیخ سعد الدین حمویؒ سے فیض حاصل کیا، واپسی کے بعد دہلی میں حضرت کاکیؒ کی خدمت میں اقامت اختیار فرمائی، اور مجاہدہ و ریاضت میں مصروف ہوئے، حضرت خواجہ اجمیریؒ نے خرقہ بخشا، اور حضرت کاکیؒ نے دستار خلافت سر پر باندھی، پھر شیخ کے حکم کے مطابق ہانسی تشریف لے گئے، اور وہیں بارہ سال قیام فرمایا، جب خلائق کا ہجوم بڑھا، تو اجودھن چلے گئے اور اسی کو اپنا مستقر بنایا، خوارق عادات و کرامات کثرت سے منقول ہیں، دنیا اور اس کی دولت و ثروت سے بے نیاز رہے، سلطان علاء الدین محمود آپ کی خدمت میں باریاب ہوا، بلبن کے توسط سے چند گاؤں کی معافی کا پروانہ دیا، حضرت نے قبول کرنے سے انکار فرمایا، بلبن جو آگے چل کر سلطان غیاث الدین ہوا اس کی بیٹی حضرت کے عقد نکاح میں تھی، اور سریر سلطنت پر بیٹھنے کے بعد بھی خانقاہ میں حاضری دیتا رہا، مگر حضرت کی شان استغنا میں کبھی فرق نہ آیا، ایک مرتبہ کسی شخص نے سفارش کے لئے مجبور کیا تو حضرت نے سلطان غیاث الدین کو حسب ذیل تحریر لکھ بھیجی،

میں نے اس کے معاملہ کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا، پھر تمھارے سامنے لایا ہوں،
اگر تم نے اس کو عطا کیا، تو عطا فرمانے والا وہی اللہ تعالیٰ ہوگا، اور تمھارا شکریہ
ادا ہوگا، اور اگر تم نے اس کو کچھ نہیں دیا، تو روکنے والا وہی اللہ ہوگا، اور تم
معذور سمجھے جاؤ گے"

حضرت کے خلفاء میں حضرت نظام الدین محمد بدایونی ملقب بہ نظام الدین اولیاء،
حضرت علاء الدین علی صابر کلیری، حضرت جمال الدین خطیب ہانسوی، اور حضرت
بدرالدین اسحٰق دہلوی تھے، حضرت نظام الدین اولیاء نے حضرت سے قرآن مجید کے ۶ پارے
اور کتاب العوارف اور کتاب التمہید کی قرات کی تھی، ان خلفاء میں سے حضرت نظام الدین
نے حضرت گنج شکر کے ملفوظات راحۃ القلوب کے نام سے اور حضرت بدرالدین اسحٰق
دہلوی نے سیر الاولیاء کے نام سے جمع کیے تھے، حضرت گنج شکر نے ۹۵ سال کی عمر میں
۶۶۴ھ / ۱۲۶۶ء میں وصال فرمایا،

شیخ ابوالموید نظام الدین بن جمال الدین غزنوی بھی حضرت بختیار کاکیؒ کے مرید تھے
حضرت نظام الدین اولیاء ان کی مجلس وعظ میں شرکت کرتے، اور ان کے پر اثر
مواعظ کے مداح تھے، ۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء میں وفات پائی،

شیخ جمال الدین احمد بن محمد ہانسوی متوفی ۶۵۹ھ / ۱۲۶۱ء، حضرت گنج شکر کے ممتاز خلفاء
میں تھے، حضرت شیخ فرماتے "الجمال جمالی" فارسی میں ایک دیوان یادگار چھوڑا، [۱]

حضرت خواجہ علاء الدین علی بن احمد صابر قدس سرہٗ حضرت گنج شکر کے محبوب خلیفہ تھے،
وہ ۵۹۲ھ / ۱۱۹۶ء میں بمقام گنجہ پیدا ہوئے، اور شیخ کی خدمت میں تعلیم و تربیت پائی، اور حضرت
گنج شکر کے اجل خلفاء میں شمار کیے گئے، اور حضرت کے توسط سے چشتی سلسلہ کو پورے ملک

[۱] نزہۃ الخواطر ص ۱۲۲

میں عام مقبولیت حاصل ہوئی، کہا جاتا ہے کہ ان پر کبھی شان جلالی کا غلبہ طاری ہوتا تھا،
ابتداء انھیں شیخ نے دہلی میں اقامت اختیار کرنے کا اجازت نامہ عطا کیا، لیکن ہدایت کی کہ
پہلے جمال الدین کو اسے دکھا لینا، وہ ہانسی تشریف لائے، اجازت نامہ ان کے ہاتھ میں دیا
اور تھوڑی دیر انتظار کرکے رخصت چاہی، شیخ جمال الدین نے کہا دہلی کیلئے بردبار صاحب
ولایت چاہیے، تم ایک لمحہ کیلئے ٹھہر نہیں سکتے، انھوں نے کچھ شان استغنا سے جواب دیا،
تو شیخ جمال الدین نے برہم ہو کر اجازت نامہ کو چاک کرکے پارہ پارہ کردیا، انھوں نے
جلال میں آکر کہا کہ اسی طرح آپ کا سلسلہ بھی پارہ پارہ ہو جائے گا، چنانچہ شیخ جمال الدین
کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا، حضرت خواجہ علاء الدین ہانسی سے لوٹ کر حضرت گنج شکر کی خدمت
میں واپس آئے، اور واقعہ سنایا، تو حضرت گنج شکر نے فرمایا جمال الدین نے جس کو ٹکڑے
کردیا ہو، میں اس کو جوڑ نہیں سکتا، اور دہلی کے بجائے کلیر جانے کی ہدایت کی، چنانچہ ۶۵۶ھ / ۱۲۵۷ء
میں کلیر تشریف لے گئے اور وہیں اقامت اختیار فرمائی، اور ان کے توسط سے سلسلۂ
چشتیہ کا عام فیض جاری ہوا، اور جب عام شہرہ ہوا تو خلائق اطراف ہند سے جوق در جوق
آکر فیض اٹھانے لگی، ۶۹۰ھ / ۱۲۹۲ء میں واصل بحق ہوئے، حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی
حضرت کے ممتاز خلیفہ تھے، [۱]

شیخ بدرالدین اسحاق بن علی بخاری دہلوی حضرت گنج شکر کے ارشد خلفاء میں سے
تھے، ان سے حضرت غایت الفت رکھتے تھے، اور اپنے قرب سے علحدہ کرنا گوارا نہیں
فرمایا، ۶۹۰ھ / ۱۲۹۱ء میں اجودھن میں واصل بحق ہوئے [۲]

حضرت نظام الدین محمد بن احمد بدایونی معروف بہ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین

[۱] نزہۃ الخواطر حصہ اول ص ۱۸۰ [۲] ایضاً

اولیاء قدس سرہ حضرت گنج شکر کے وہ دوسرے ممتاز خلیفہ ہیں جن کے توسط سے چشتی نظامی سلسلہ کی پورے ملک میں اشاعت ہوئی، حضرت محبوب الٰہی ۶۳۴ھ / ۱۲۳۶ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے، پانچ سال کی عمر میں والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، والدۂ محترمہ کی آغوش میں تربیت پائی، شیخ علاء الدین اصولی سے فقہ، اصول، اور دوسرے دینی علوم کی تحصیل کی، ۱۵ سال کی عمر میں دہلی تشریف لائے، اور یہاں کے اساتذہ شمس الدین خوارزمی، کمال الدین ماریکلی وغیرہ سے تحصیل علم کی تکمیل فرمائی، پھر ۶۵۵ھ / ۱۲۵۷ء میں دہلی تشریف لائے، اور یہیں اقامت کی اجازت عطا کی گئی، اور رشد و ہدایت کا فیض جاری ہو گیا، یہ ملوک سلاطین کا آخری دور تھا، حضرت کا قیام غیاث پور میں تھا، معز الدین کیقباد نے اس کے قریب کیلوکھری میں شاہی محل تعمیر کرایا، دربار کے قریب ہونے کی وجہ سے امراء و اکابر کی آمد و رفت یہاں شروع ہوئی، اسی اثناء میں خلجی سلطنت کا آغاز ہوا، اور حضرت کے فیوض و برکات کا یہ سلسلہ اس دور میں جاری رہا، سلاطین و امراء نے سر نیاز خم کیا اور اپنی طرف حضرت کی نگاہ کرم منعطف کرانے کو ابدی سعادت تصور کیا، حضرت کی تصنیفات میں فوائد الفواد، افضل الفوائد، اور راحۃ المحبین ہیں، ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء میں واصل بحق ہوئے،[1]

حضرت شیخ صدر الدین عارف حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے صاحبزادے اور جانشین تھے، سلطان غیاث الدین کے بیٹے شاہزادہ محمد کو ان سے عقیدت تھی، ان کی مجلس میں حاضر ہوا کرتا تھا، ۶۸۴ھ / ۱۲۸۴ء میں وفات پائی،

شیخ ابو علی شرف الدین قلندر اس عہد کے ممتاز علماء و مشائخ میں سے تھے، ۶۰۵ھ / ۱۲۰۸ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے، اکابر علماء سے علوم کی تحصیل کی، عالم اسلامی کی سیاحت فرما کر صلحائے امت کے فیوض سے بہرہ اندوز ہوئے، حضرت شمس الدین تبریزی اور

۱؎ نزہۃ الخواطر حصہ دوم ص ۱۲۲، طبع ۱۳۵۰ھ،

جلال الدین رومی سے خرقہ حاصل کیا، تیس سال تک درس و افادہ کی خدمت انجام دی، پھر سکر و مستی کا عالم طاری ہوا، اور آخر عمر تک باقی رہا، ان کی تصنیفات میں حکمت نامہ اور چند دیگر رسائل تصوف میں ہیں، ۷۲۴ھ / ۱۳۲۴ء میں واصل بحق ہوئے،[1]

شیخ ایوب ترکمانی بہرام شاہ کے زمانہ میں با اقتدار مشائخ میں تھے، مارہرہ ان کا مرکز تھا، سلطان کو ان سے عقیدت تھی، دہلی آیا جایا کرتے تھے، اور مختلف امور میں بہرام شاہ سے اپنی مرضی کے احکام صادر کراتے تھے،[2]

شیخ ابو بکر طوسی بلبن کے عہد کے ممتاز مشائخ میں سے تھے، بلبن نے ان کے لئے ایک بڑی خانقاہ تعمیر کرائی تھی جس میں لنگر جاری تھا، شیخ جمال الدین ہانسوی ان کے فضل کے معترف تھے، اور ان کی مجلس میں تشریف لایا کرتے تھے،[3]

شیخ حسام الدین ملتانی حضرت صدر الدین محمد بن زکریا ملتانی کے مریدین میں سے تھے، ۶۸۷ھ / ۱۲۸۸ء میں وفات پائی،[4]

حضرت خواجہ محمد بن حسن اجمیری حضرت خواجہ اجمیری کے خلف صدق تھے، اجمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں حضرت خواجہ کے دامن تربیت میں فیض اٹھایا، اور ان کے بعد مشیخت و ارشاد کے منصب پر سرفراز ہوئے، ۶۵۳ھ / ۱۲۵۵ء میں وفات پائی،[5]

شیخ نجیب الدین بن عماد الدین فردوسی دہلوی، شیخ رکن الدین فردوسی کے مرید تھے، حضرت مخدوم شیخ احمد بن یحییٰ منیری ان کے مرید و خلیفہ تھے، ۶۹۱ھ / ۱۲۹۲ء میں دہلی میں واصل بحق ہوئے،[6]

۱؎ نزہۃ الخواطر ص ۵ ۲؎ ایضاً ۱۲۵ ۳؎ ایضاً ص ۱۲۳ ۴؎ ایضاً ص ۱۴۰ ۵؎ ایضاً ۱۴۲
۶؎ ایضاً ص ۲۳۵،

شیخ بابا رجب گجراتی حضرت سید احمد کبیر رفاعی کے مرید تھے، ۶۱۶ھ میں گجرات میں آئے، نہر والہ میں قیام تھا، ایک خلق کثیر ان کے ہاتھ پر اسلام لائی، ۶۷۰ھ / ۱۲۷۱ء میں وفات پائی،[۱]

شیخ عثمان بن حسن مروندی معروف بہ لعل شہباز ۶۶۲ھ / ۱۲۶۴ء میں ملتان پہنچے، سلطان غیاث الدین کے بیٹے شاہزادہ محمد نے ان کے لئے ایک عظیم خانقاہ تعمیر کرائی، اور وہ رشد وہدایت میں مصروف ہوئے، ۶۷۳ھ / ۱۲۷۴ء میں سیوستان میں مدفون ہوئے،[۲]

شیخ فخر الدین میرٹھی حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے مرید و خلیفہ تھے، رتبۂ شیخیت تک سرفراز ہوئے، کہا جاتا ہے کہ وہ سکندر یونانی کی نسل سے تھے،[۳]

شیخ نجیب الدین بن سلیمان متوکل حضرت گنج شکر کے خلفا میں سے تھے، ۶۶۹ھ / ۱۲۷۰ء میں دہلی میں وفات پائی،[۴]

شیخ حسین بن علی بخاری حضرت زکریا ملتانی کے مرید تھے، اور بھکر میں مستقل سکونت رکھتے تھے، ۶۹۵ھ / ۱۲۹۶ء میں وفات پائی،[۵]

مولانا شیخ شرف الدین عراقی جو حضرت شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے، ۶۸۶ھ / ۱۲۸۷ء میں وفات پائی،[۶]

اسی طرح اس دور کے ممتاز صوفیہ و مشائخ میں شیخ عبد الرشید کیتھلی متوفی ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء (نزہۃ الخواطر ۱۰۶) شیخ خواجہ عزیز کرکی بدایونی فقیہ و صوفی متوفی ۶۶۶ھ / ۱۲۶۷ء (۱۰۸) سید محمد ابن شجاع مکی متوفی ۶۴۶ھ / ۱۲۴۸ء (۱۴۰) شیخ بدر الدین محمد بن محمد سندھی متوفی ۶۸۰ھ / ۱۲۸۱ء بہ بھکر (۲۲۳) سید صدر الدین محمد بن محمد بھکری متوفی ۶۶۹ھ / ۱۲۷۰ء (۲۲۶) شیخ نور الدین لاری متوفی ۶۹۵ھ / ۱۲۹۶ء (۲۳۸) وغیرہ کے وجود گرامی سے رشد وہدایت کا عام فیض جاری تھا،

---

[۱] نزہۃ الخواطر ص ۱۵۰، [۲] ص ۱۸۰، [۳] ص ۱۹۵، [۴] ص ۲۱۳، [۵] ص ۱۴۳، [۶] ص ۱۶۴

مملوک سلاطین کا دور حکومت

مملوک سلاطین کے خاتمہ پر دہلی سلطنت کے ان سلاطین کے سلسلہ کا خاتمہ ہوا، جن کا آغاز سلطان شہاب الدین غوری سے ہوا تھا کہ اسی کے غلام در غلام تاجدار بن کر تخت نشین ہوتے گئے، اس کے ساتھ سلطان محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کے ہاتھوں سے ہندوستان کو زیر نگیں کرنے کی جو مہم شروع ہوئی تھی، وہ بھی اسی دور میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی،

ہندوستان پر مسلمانوں کے حملہ آور ہونے کے محرکات

غزنوی اور غوری کشور کشاؤں کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے محرکات کیا تھے، ہمیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لینا چاہئے، عام طریقہ سے محمود کی بت شکنی کے جذبہ کو شہرت دی گئی ہے، مگر یہ تمام تر یورپ کے مورخین کے ذہن کی پیداوار ہے، ان نو مسلم ترکوں میں اس قسم کے کسی جذبہ کے بجائے در اصل اس زمانہ کی سماجی زندگی کے وہ مطالبے تھے، جو بلندی اور نام آوری حاصل کرنے کے لئے فوجی طاقتیں مہیا کرکے سپہ سالار ایک ملک سے دوسرے ملک میں جایا کرتے تھے، ہندوستان کی دولت کی شہرت عام تھی، اس میں بھی ایک خاص قسم کی کشش موجود تھی، ان قبائل میں اپنی نوآبادیاں قائم کرنے کا جذبہ بھی پایا جاتا تھا، وہ اپنے بڑے بڑے جرگوں کے ساتھ نکل جاتے، اور جہاں سرسبزی نظر آتی وہاں ڈیرے ڈال دیتے تھے، محمود نے ہندوستان کو خاص طور پر رہنے کیلئے پسند کیا تھا، لیکن وہ یہاں اقامت اختیار نہ کر سکا،

مسلمانوں کو ان کی زندگی کے تمام شعبوں میں عمومی آزادی

سلاطین دہلی کے زمانہ میں جن حکمرانوں کے ہاتھوں میں تلوار تھی، انھیں اس پر اتنا بھروسہ تھا کہ انھوں نے ہندوستان کے پرانے رہنے والے کو نیست کرنے کا کبھی قصد نہیں کیا، یہاں انھوں نے قانون اسلام جاری کرنے کی ضرورت کبھی

محسوس نہیں کی، تا مسلمانوں کو عام اجازت تھی کہ وہ ہتھیار بند رہیں، اور اپنی مرضی کے مطابق
جرگے تیار کریں، ان کی سماجی، معاشرتی و اہلی زندگی سے بھی کوئی تعرض نہیں کیا جاتا تھا، انھیں
ہر قسم کی پوری آزادی حاصل تھی، انھیں اپنی اقتصادی و معاشی ترقی حاصل کرنے کے پورے
مواقع دیئے گئے تھے، اور اسی زمانہ میں وہ حکومت کے شعبوں سے بھی کہیں کہیں وابستہ ہونے
لگے تھے،

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی حیثیت

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اگر ہندوستان پر حملہ آوری
میں کوئی دینی جذبہ کارفرما ہوتا تو وہ یہاں کی سلطنت کی بنیاد
اسلامی اصول و شرائع پر قائم کرتے، اگرچہ بعض مورخین نے اس سلطنت کو خالص "اسلامی
سلطنت" لکھا ہے جس کی بنیاد شرعی احکام پر قائم تھی، لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ عملی طور پر
دراصل یہ اسلامی سلطنت نہ تھی، اور برنی جیسے مورخ کو بھی اپنی تصنیف "فتاویٰ جہانداری"
میں یہ اقرار کرنا پڑا ہے کہ یہاں بادشاہی کا نظام خالص "دنیاداری" پر قائم تھا، جو "دینداری"
کے قطعی خلاف تھا، جس کا قیام غیر اسلامی طور و طریق اور طرز حکومت کو اختیار کئے بغیر ممکن نہ تھا
سلطان اگرچہ خود اسلامی عقیدہ کا قائل اور شرائع کا پابند تھا، لیکن اس کی سلطنت کا نظام
شرائع کے بموجب قائم ہونے کے بجائے خالص تسلط اور فوجی طاقت پر قائم تھا، اس نظام
میں شرائع کو بھی وہی حیثیت حاصل تھی، جو دوسرے قوانین کو تھی، اس لئے دراصل یہاں
مسلمانوں نے جس سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی، وہ مذہبی حکومت کے بجائے غیر مذہبی اور
غیر جانبدار سلطنت (سیکولر اسٹیٹ) تھی، پروفیسر حبیب اللہ نے یہ صحیح لکھا ہے کہ

> مورخین کے بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سلطنت خالص اسلامی ریاست تھی، جو اپنی پالیسی
> کو شریعت کے مطابق بنانے کی کوشش کرتی تھی لیکن جیسا کہ گذشتہ ابواب سے معلوم ہوا ہوگا

عملاً ایسی نہ تھی، بادشاہت کے غیر اسلامی طرز کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں، برنی نے اس کا اعتراف
کیا ہے، کہ دنیاداری جس کا منتہائے کمال بادشاہت ہے، وہ دینداری کے خلاف ہے،
برنی نے یہ بتایا ہے کہ بادشاہت کے مشرکانہ طریقے اسلام میں جاری رہے اور اسی کے
بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ بغیر غیر اسلامی طریقہ کے بادشاہت ممکن نہیں، بعض خوش عقیدہ
مذہبی گروہ اپنے کو یہ تسلی دے سکتا ہے کہ سلطان صرف مذہب کی اشاعت اور شریعت
کی بقا ہی کیلئے ہوتا ہے، لیکن بغیر کسی شک وشبہہ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے
اعمال میں جو چیزیں فیصلہ کن ہوتی تھیں وہ قوت اور ضرورت کا قانون تھیں، برنی
نے بادشاہت کی اصلیت اور نوعیت کی تفصیل بتائی ہے، وہ کہتا ہے، کہ بادشاہت
کے معنی استیلا کے ہیں، چاہے وہ قانونی طریقہ سے ہو یا قوت سے ہو، اور شریعت کی
عملی طور پر اس سے زیادہ توقیر نہ تھی جیسے دوسرے قوانین کی، برنی کو یہ اعتراف
ہے کہ مسلمانوں کو جو سزائیں دی جاتی تھیں وہ قرآن پاک کے خلاف تھیں، لیکن
ان کو روا رکھا جاتا تھا، اسی طرح قانون وراثت اور حلال و حرام کا امتیاز
اور دوسری معروف امتناعی پابندیوں کو توڑ دیا جاتا تھا، مذہبی طبقہ اس کے
خلاف احتجاج ضرور کرتا تھا، سود کے متعلق جو شرعی پابندیاں تھیں ان کا مطلق لحاظ
نہیں کیا جاتا تھا، امیر خسرو نے واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک تنکہ پر ایک جیتل سود
ماہوار لیا جاتا تھا، اور فریقین میں جب تحریری معاہدہ ہو جاتا تھا تو اس کو قانونی
درجہ حاصل ہو جاتا تھا، اور قاضی کو اس کو عمل میں لانا پڑتا تھا، وہ چار شرائط
برنی نے بادشاہوں کو عمل کرنے کیلئے لکھے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جب
کسی ضابطہ کو جاری کرے، تو ان میں سے اگر کوئی شریعت کے خلاف ہو تو وہ

واپس نہ لئے جائیں، بلکہ جب تک ضرورت ہو اس کو قائم رکھا جا سکتا ہے۔"[۱]

ہندوستان میں مسلمانوں کی اسی غیر مذہبی سلطنت کی تاسیس عمل میں آئی، اور بیشتر مسلمان سلاطین نے اپنے بیشتر زمانوں میں اپنے کو غیر مذہبی حکمراں تصور کیا، انھوں نے اپنی ذات اور مسلمانوں کیلئے دین کی عام پابندی کو لازم کر رکھا تھا، مگر مسلمانوں کے ساتھ اپنے سیاسی برتاؤ میں اس کا لحاظ نہیں رکھا تھا، اس طرح وہ دینداری اور دنیاداری دونوں کو دونوں پلڑوں پر رکھ کر نظم حکومت سنبھالے ہوئے تھے اور ان میں سے جو سلاطین دینداری کی طرف مائل ہوتے ان کا پلڑہ کسی قدر جھک جاتا، اور جو خالص دنیاداری کے رخ کو سامنے رکھتے تو وہ اس سمت کو جھک جاتے تھے، یہی طرز مملوک سلاطین ہند سے لے کر تیموری سلطنت کے چراغ کے بجھنے تک قائم رہا، تیموری دور میں دینداری و دنیاداری کے دونوں سروں کو دو حکمرانوں عالمگیر اور اکبر نے اپنے اپنے دوروں میں اپنے کردار سے زیادہ نمایاں کر دیا تھا، اور اسی لئے ان دونوں کی بادشاہی کا طرز ایک دوسرے کے بالکل برعکس تھا، با ایں ہمہ پورے اسلامی دور میں کسی ایک حکمراں کا بھی زمانہ ایسا مشکل سے مل سکتا ہے جس کو ہم خالص اسلامی حکومت سے تعبیر کر سکتے ہوں اور جس میں ہم عہد صدیقی و فاروقی کی مثالیں دیکھ سکتے ہوں، بلکہ یہاں اسلامی حکومت کے بجائے مسلمان بادشاہوں کی حکومت قائم تھی، جس میں جب حکمرانوں اور محکوموں میں ارتباط بڑھا تو دونوں کو یکساں حیثیت کے شہری حقوق حاصل ہو گئے اور حکومت کا کوئی عہدہ یا منصب محض نامسلمان ہونے کے سبب سے کسی کے لئے بند نہیں رہ گیا،

ہندوستان کی حفاظت

مملوک سلاطین اپنے دور حکمرانی میں مغربی سرحد کی حفاظت کی

---

[۱] فونڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا ص ۲۱۵،

اہم خدمت انجام دیتے رہے، اس دور میں وسط ایشیا میں پے در پے انقلابات آئے، اور ان کی لہریں دریائے سندھ تک بھی پہنچیں مگر ان سلاطین نے ان کی موجوں کو پھیر دیا، اور پنجاب تک کے علاقہ کو مضبوطی سے زیر نگیں رکھا، ان کا یہ کارنامہ مغل سلاطین کے کارناموں سے بڑھا ہوا تھا، اس لئے کہ مغلوں کے تسلط میں افغانستان اور قندھار کا علاقہ بھی تھا، اور انھیں آگے بڑھ کر ہندوستان کی سرحد کی حفاظت کا موقع حاصل تھا،

حکومت کا ڈھانچہ

اس لئے ان سلاطین دہلی کی مرکزی حکومت پر ملکی حفاظت و مدافعت کا عظیم بار تھا، اور اسی لحاظ سے ان کے غیر معمولی مصارف بھی تھے، اور مرکزی حکومت سب سے زیادہ فوجی اخراجات ہی پر صرف کرتی تھی،

اس دور وسطی میں مسلمان سلاطین کی سلطانی کا استناد خلفا کی منظوری سے حاصل ہوتا تھا، ہندوستان کے یہ سلاطین بھی خلفا سے اپنا رسمی رشتہ قائم رکھتے تھے، اور رسماً خلیفۃ المسلمین کو سب پر تفوق حاصل تھا، اور یہ سلاطین گویا اس کی طرف سے نیابۃً حکومت کرتے تھے، اسلئے خطبہ میں خلفاے اسلام کے ساتھ ان کے نام بھی لئے جاتے تھے،

حکومت کے شعبے

سلطان کے بعد قدرۃً وزراء کو اہمیت حاصل تھی جنھیں نظام الملک، مؤید الملک، صدر الملک، عین الملک وغیرہ کے خطابات دیئے جاتے تھے، لیکن یہ وزراء صرف کشوری امور کے مالک تھے، شعبۂ عسکری، شعبۂ مال، دیوان انشار، معاملات خارجہ، اطلاعات، وزارت انصاف کے شعبے علحدہ قائم تھے، ان کے علاوہ امیر حاجب، وکیل در، سارجاندار اور کبھی نائب مملکت کے عہدہ دار مقرر ہوئے، پھر آخر میں نیابت کے عہدے مستقل کر دیئے گئے، جس میں نائب وزیر، نائب وکیل وغیرہ عہدہ دار تھے،

فوج

فوج کی کئی قسمیں تھیں، ایک تو شاہی فوج تھی، جو ملک اور خصوصاً سرحد کی حفاظت

پر مامور رہتی تھی، دوسرے صوبائی فوجیں صوبہ داروں کے ماتحت تھیں، کبھی ضرورت کے وقت نئی بھرتی ہوتی تھی، فوج کے افسروں کو تنخواہیں نہیں دی جاتی تھیں، جاگیریں سپرد تھیں، البتہ قائم فوج کے سپاہیوں کی تنخواہیں، جو مواجب کہلاتی تھیں مقرر تھیں،

آئین و عدالت قانون شریعت بنیادی آئین سمجھا جاتا تھا، مگر ضرورت کے مطابق اسکے خلاف عمل ہوا کرتا تھا، ہندوؤں کے لئے ہندو کوڈ کے مطابق قانون نافذ تھے، خصوصاً پرسنل لا میں انھیں کامل آزادی حاصل تھی، صدر جہاں کا عہدہ ہندوستان کی مرکزی عدالت کے چیف جسٹس کے لئے تھا، امراء و وزراء سے رتبہ و احترام میں اس منصب کا درجہ اونچا تھا، چنانچہ مورخین نے فہرست میں شاہزادوں کے بعد ان کے نام لکھے ہیں، وہ صدر جہاں کے علاوہ قاضی قضاۃ، قاضی ممالک یا شیخ الاسلام بھی کہے جاتے تھے، عدالتی نظام و انصرام و تقرر کے سارے اختیارات اسی کو حاصل تھے،[1]

پھر اس کے ماتحت عہدہ دار تھے، دیوانی کے مقدمات قاضی اور فوجداری کے مقدمات امیر داد سماعت کرتے تھے، کوتوال اور محتسب پولیس کا کام کرتے تھے،

زکوٰۃ کا نظم بھی قائم تھا، اور دوسرے محاصل بھی لئے جاتے تھے، مسی، نقرئی اور طلائی سکے کئی قسم کے جاری تھے، "ہندوستان کے عہد اسلامی میں زکوٰۃ کا نظام" کے عنوان سے اس مجموعہ میں ایک مستقل تحریر علیحدہ مندرج ہے،

ڈاک کا نظم ڈاک کے نظم کا بڑا عہدہ دار "برید ممالک" کہا جاتا تھا، اس کا صدر دفتر پایہ تخت میں تھا، اس کے ماتحت راستوں کا معقول نظم قائم رہتا تھا،

صوبوں کا نظم صوبوں کا نظم اس طرح قائم تھا کہ صوبہ دار اپنے حدود کے کامل ذمہ دار ہوتے

[1] طبقات ص ۱۲۵، ۱۷۰، برنی ص ۲۴، ۱۲۶،

تھے، کبھی نائب والی بھی مقرر ہوتے تھے، صوبوں میں بھی چھوٹے پیمانہ پر حکومت کے وہ سب شعبے موجود تھے، جو مرکز میں قائم تھے، اس زمانہ میں صوبوں کے لئے اقطاع کی اصطلاح عام تھی، صاحب اقطاع کو عدالتی نظام میں دخل دینے کا اختیار حاصل تھا، صوبہ دار شحنہ و کوتوال کی مدد سے نظم و امن قائم رکھتا تھا، اور مرکزی حکومت کی طرف سے خطبہ و سکہ جاری رہتا تھا، کبھی باجگذار صوبے اپنا سکہ علیحدہ بھی جاری کرتے تھے،

سلاطین کا طرز بود و ماند مورخین نے ملوک سلاطین کے شاہانہ طرز بود و ماند کی نہایت دلکش تصویر کھینچی ہے، سلطان کے گرد صدہا نقیب و چاؤش، پیادہ و سرہنگ امراء و فوجی سردار جمع رہتے تھے، اور ایسا دبدبہ چھایا رہتا تھا کہ کبھی بڑی بڑی سلطنتوں کے امراء و سفراء "خاکبوسی" یعنی سلام کے وقت شدت تاثر سے لڑکھڑا کر گرجاتے اور بے ہوش ہو جاتے تھے، اس طریقہ سے رعب و دبدبہ قائم کرکے فتنہ انگیزی کو روکنا مقصود تھا، حالانکہ خود پرستی و عظمت نمائی کے یہ طریقے اسلام اور اس کی تعلیمات کے منافی تھے، لیکن بلبن خود کہتا ہے کہ ان کو جائز اس لئے رکھا گیا کہ قیام امن و عدل میں ان سے مدد ملتی ہے،[1] مظلوموں کی دادرسی ان سلاطین کا خاص شیوہ رہا، نیز وہ امور دین میں دینداری کو راہ دینے کا جذبہ بھی رکھتے تھے، لیکن انھوں نے اپنی حکومت کو اسلام کی اشاعت کا ذریعہ نہیں بنایا،

اسلام کی اشاعت اس دور میں اسلام کی اشاعت ضرور ہوئی، مگر وہ حکومت کے بل پر ہونے کے بجائے مسلمانوں کے ہندوستان کی منتشر آبادیوں میں گھل مل کر رہ بس جانے سے ہوئی، ہندوؤں میں "مورتی پوجا" پر عقیدہ کمزور ہوتا گیا، توحید اور مساوات انسانی کے جذبات کی ان میں پرورش ہوئی، ہندوؤں کے مختلف فرقوں نے بعض اس زمانہ میں اور بعض آگے چل کر توحید کی تعلیمات کو اصول کے طور پر مانا، اور ویش، شودر، کھتری اور برہمن کی

[1] برنی ص ۴۱، ۳۱، ۳۲،

تفرقوں کو مٹایا، صوفیۂ کرام شمالی ہند کے گوشہ گوشہ میں پہنچ چکے تھے، اور اسلامی تصوف کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کو فروغ ہوتا جاتا تھا، خصوصاً خانوادۂ چشتیہ نے وہ خدمات انجام دیئے جو سلاطین دہلی سے انجام نہ پا سکے، کلاہ تتری رکھنے والے درویش صفت امیر اور خواجہ حسن نے سلطان نظام الدین اولیاء کی چوکھٹ چومی،

اس دور میں علمائے دین بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے اور خدمتیں انجام دیتے تھے، مسجدیں اور مدرسے ان کی سیادت میں معمور تھے،

علوم کی ترقی

جیسا کہ اوپر گذرا مملوک سلاطین نے علوم کی ترقی میں غیر معمولی دلچسپی لی، ضیاء الدین برنی نے ہر ایک سلطان کے عہد حکومت کے بیان میں شعراء، علماء، فضلاء، فقہا، محدثین وغیرہ کی طویل فہرست درج کی ہے، تذکرہ کی کتابوں میں مختلف مدارس کا حال ملتا ہے، اس دور میں جو علمی و تعلیمی ترقیاں ہوئیں ان کا ذکر اجمالاً اوپر گذرا، اور تعلیمی ترقیوں کا تفصیلی بیان اس مجموعہ کے دو مستقل مقالوں میں علحدہ آیا ہے،

ایک نئے کلچر کی تخلیق اور انسانی آبادی کے طبقات

ہندوستان کے شمالی حصہ میں اس دور میں ایرانیوں، افغانیوں اور ترکوں نے عربوں کے تمدن سے آمیزش کے بعد مسلمانوں کی سوسائٹی میں یہاں ایک طبقہ اعلیٰ قائم کر لیا تھا، اور پھر ہندوؤں میں سے ایک بڑا طبقہ اسلام میں داخل ہو گیا اور جیسا کہ گذرا وہ ترقی کر کے نیابت مملکت کے منصب تک پہنچا، اس طرح شمالی ہند میں ایک ایسے کلچر کی بنا پڑی جس میں عرب تمدن آمیز ایرانی، افغانی، ترکی کلچر میں ہندی کلچر کی آمیزش ہوئی، اور ایک نئے کلچر کی تشکیل عمل میں آئی، دوسری طرف سندھ میں عربوں کے غالب اثرات سے ہندی کلچر کی آمیزش سے ایک جداگانہ کلچر کی تشکیل ہو رہی تھی، اس طرح شمالی ہند کے نئے کلچر میں ایرانی اور سندھ کے نئے کلچر میں عربی اثرات نمایاں تھے، مملوک سلاطین کے دور میں

شمالی ہند اور سندھ و ملتان کے ان دونوں کلچروں کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملا، اور ایک نیا ہندوستانی کلچر عالم وجود میں آیا، اور سوسائٹی میں طبقۂ اعلیٰ کے وہ مسلمان جو مختلف نسلوں کے تھے، اس کلچر کے روح رواں رہے، اس سوسائٹی میں اہل سیف اور اہل قلم کی دو قسمیں تھیں، اہل سیف میں ارباب حکومت اور اہل قلم میں ارباب علم داخل تھے، عدالت و قضا کا نظم موخر الذکر طبقہ ہی کے قبضہ میں تھا، تیسرا گروہ "عوام" اور "خلق" کا تھا، تجار کا طبقہ ان ہی میں سے تھا، جن میں ملک التجار بھی ہوتے تھے، اور امتیازی شان حاصل کرتے تھے، عوام کا بڑا طبقہ کاشتکاری اور کارخانوں میں کام کرتا تھا، مذہبی حیثیت سے ملک میں سنی، شیعہ، صوفیہ اور نامسلمانوں کا طبقہ تھا، شیعوں میں کا غالی طبقہ موسوم بہ ملاحدہ و قرامطہ تھا، اسی طرح سنیوں میں حنفی و شافعی دونوں تھے،

تجارتی ترقی

اس عہد میں ہندوستان کے تجارتی تعلقات ایران و عرب سے قائم تھے، حالانکہ مملوک سلاطین کے قبضہ میں کوئی بندرگاہ نہ تھی، ملکی تجارت بھی فروغ پر تھی، مختلف قسم کے کارخانے قائم تھے جن میں سامان تیار ہوتا تھا، زرعی ترقی اس ملک کی جان تھی، حکومت امن و امان قائم رکھ کر اور کسانوں کو آسانیاں مہیا کر کے زراعت کو ترقی دیتی تھی، اندرون ملک میں راستوں کا مضبوط نظم قائم تھا، تجارتی راستے زیادہ تر دریائی تھے، بحری اور بری راستوں اور ان کے وسیلوں کا نظم قائم رکھا جاتا تھا، جس کی وجہ سے غیر معمولی تجارتی و صنعتی ترقیاں عمل میں آئیں،

ہندوستان کی مرکزیت عالم اسلامی میں

ہندوستان کی تجارتی و صنعتی ترقیوں اور فارغ البالیوں کا شہرہ ایسا ہوا کہ وسط ایشیا و دوسرے اسلامی ملکوں سے لوگ نقل وطن کر کے آنے لگے اور مختلف صناع، تجار، علماء اور اہل حرفہ اس ملک میں آباد ہو گئے، اس تمدن کا سب سے اہم مرکز خود پایہ تخت دہلی تھا، چنانچہ اس دور کے خاتمہ کے چند سال بعد جب ۷۳۴ھ میں مشہور سیاح ابن بطوطہ ہندوستان آیا، تو اس کو اعتراف کرنا پڑا کہ

"دہلی کو نہ صرف بلاد ہند بلکہ تمام مشرقی دنیائے اسلام کے شہروں پر تفوق حاصل ہے"

السّامری

از

مولانا ابو الجلال صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

جس شخص کے بہکانے سے بنی اسرائیل نے گوسالہ کی پرستش کی تھی، اس کا ذکر قرآن میں خدا نے السامری کے لقب سے کیا ہے، اس قصہ میں بائبل کا بیان قرآن سے مختلف ہے، مسلمان ایسی صورتوں میں بائبل کو اور اہل کتاب قرآن کو مسترد کر دیا کرتے ہیں، اہل انصاف کا فرض ہے کہ قرآن کے بیان کا بائبل کے بیان سے مقابلہ کرتے وقت قرآن کے اس دعویٰ کا بھی لحاظ رکھا کریں کہ

ان ھذا القرآن یقص علی بنی اسرائیل اکثر الذی ھو فیہ یختلفون (نمل)	یہ قرآن بنی اسرائیل کو اکثر وہ باتیں سناتا ہے جن کے متعلق وہ باہم مختلف ہوتے ہیں،

قرآن کریم بائبل کے بیانوں کی اصلاح کے ساتھ تصدیق کیا کرتا ہے، اصلاح و تصدیق کی خوبیاں سمجھنے کیلئے ہم کو اس موقع پر قرآن سے پہلے بائبل پر نظر ڈالنی چاہیے،

سفر تثنیہ یہ قصہ بائبل کے جن صحیفوں میں مذکور ہے، ان میں سب سے قدیم سفر تثنیہ ہے، ۶۲۵ ق م میں جب یوشیاہ بنی یہوداہ پر حکومت کرتا تھا بیت المقدس کے سردار کاہن خلقیاہ نے "خداوند کے گھر میں توریت کی کتاب پائی"، (ملوک ۲۲: ۸) جو کہ خود حضرت موسیٰ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی (ایام ۳۴: ۱۴) یہ وہی کتاب تھی جو حضرت موسیٰؑ نے اپنے

ہاتھ سے لکھ کر عہد کے صندوق میں رکھوائی تھی، (تثنیہ ۳۱: ۲۶) ۶۲۵ ق م اس کے توراۃ ہونے پر اجماع ہوا، آخری فصلوں کے اضافہ کے ساتھ یہی کتاب وہ ہے جسے موسیٰ کی پانچویں کتاب کہا جاتا ہے، یہ کتاب حضرت موسیٰؑ کا وصیت نامہ ہے اس کے اندر حضرت موسیٰؑ فرماتے ہیں:-

یاد رکھنا بھول نہ جانا کہ تم نے خداوند اپنے خدا کو بیابان میں کیونکر غصہ دلایا تھا (۹: ۷) تم نے خداوند اپنے خدا کا گناہ کیا تھا، اپنے لئے ایک ڈھالا ہوا بچھوا بنایا تھا، اور بہت جلد اس راہ سے پلٹ گئے تھے جو خدا نے تمھیں بتائی تھی (۹: ۱۶) وہ تم پر بہت خفا تھا تم کو نابود کر دینا چاہتا تھا لیکن خداوند نے اس وقت میری سنی (۹: ۱۹) اور خداوند کا غصہ ہارون پر بھی بھڑکا اور اسے ہلاک کرنے پر تھا لیکن میں نے اس وقت ہارون کے لئے بھی دعا مانگی (۹: ۲۰) اور میں نے تمھارے گناہ کو یعنی اس بچھڑے کو جو تم نے بنایا تھا لیا اور آگ میں جلایا اور اسے کوٹا اور پیس پیس کر ایسا کہ وہ غبار ہو گیا، اور میں نے اس راکھ کو اس چشمے میں جو پہاڑ سے نکلا تھا ڈال دیا، (۹: ۲۱)

سفر اعمال سفر تثنیہ کے اس بیان سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ عام بنو اسرائیل نے بچھوا پوجا تھا، اور دوسری یہ کہ حضرت ہارونؑ سے بھی ان ہی دنوں کسی بات پر خدا ناراض ہوا تھا، اس کتاب میں یہ مذکور نہیں ہے کہ حضرت ہارونؑ کا قصور کیا تھا، سفر اعمال میں ہے کہ حضرت استفنس شہید پر ایک بار یہود نے حضرت موسیٰؑ اور خدا کے خلاف کفر بکنے کا الزام لگایا، عدالت میں اپنے عقائد کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے قدیم تاریخ کے کچھ واقعات بھی سنائے جن کے درمیان فرمایا،

"اسی موسیٰ کو جس سے انھوں نے یہ کہکر انکار کیا تھا کہ تجھے کس نے ہمارا حاکم اور قاضی بنایا ہے، خدا نے اس فرشتہ کی معرفت جو اسے جھاڑی میں نظر آیا تھا مبعوث فرمایا تاکہ وہ حاکم اور چھٹکارا دینے والا ہووے، انھیں نکال لایا، اور ملک مصر میں، لال سمندر میں اور ۴۰ برسوں تک بیابان میں معجزے اور نشانیاں دکھاتا رہا (۷: ۳۵ و ۳۶) مگر ہمارے باپ دادوں نے اس کا تابعدار ہونا نہیں چاہا اور ان کے دل مصر کی طرف مائل ہوے، اور انھوں نے ہارون سے کہا کہ ہمارے لئے ایسے معبود بنا جو ہمارے آگے آگے چلیں، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس موسیٰ کو کیا ہو گیا ہے جو ہم کو مصر سے نکال لایا ہے، اور انھوں نے انہی دنوں ایک بچھوا بنایا اور اس بت کو قربانی چڑھائی، اور اپنے ہاتھ کے کاموں پر خوشی منائی، (۷: ۳۹ تا ۴۱)

سفر خروج سفر تثنیہ سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت ہارونؑ سے خدا ناراض تھا، سفر اعمال سے یہ معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل نے بچھوا بنا دینے کی حضرت ہارونؑ سے فرمایش کی تھی، ان دونوں باتوں کو ملا کر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ حضرت ہارونؑ نے ان کی فرمایش پوری کر دی تھی، لیکن حضرت استفنس شہید کا یہ قول کہ انھوں نے ان ہی دنوں ایک بچھوا بنایا، حضرت ہارونؑ کو بچھوا بنا دینے کا مجرم قرار نہیں دیتا، حضرت استفنس کے بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت ہارونؑ نے ان کی درخواست کا کیا جواب دیا تھا، سفر خروج کے موجودہ صورت بیان کے متعلق حضرت ہارونؑ نے ان کی درخواست پوری کر دی تھی، لیکن غور اور تحقیق کے ساتھ سفر خروج کو پڑھنے کے بعد ہم قطعی طور پر اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ بچھوا بنا دینے کا جرم حضرت ہارونؑ پر لگانے کی ذمہ داری سفر خروج

کے مولف نے یہ الزام حضرت ہارونؑ پر نہیں بلکہ ایک اور شخص پر لگایا تھا جس کا نام حور ہے،

سفر خروج ان پانچ کتابوں میں سے ایک ہے جن کو موسیٰ کی کتابیں کہا جاتا ہے، لیکن محققین نے متعدد دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب تین مختلف تحریروں کا مخلوط مجموعہ ہے، غالباً یہ کتاب سنہ ۴۰۰ ق م میں یا اس کے بعد تالیف کی گئی مگر اس میں قدیم تحریریں بھی ہیں،

سفر خروج کے سترھویں باب میں جو ایک قدیم کتاب سفر زکرون سے منقول ہے، فیدیم نام ایک مقام میں عمالقہ و بنی اسرائیل کی جنگ کا ذکر ملتا ہے، اس موقعہ پر ہم کو حضرت موسیٰ کے ساتھ ان کے چپ و راست حضرت ہارونؑ اور ایک شخص حور ملتے ہیں، پھر آگے چل کر چوبیسویں باب میں ہم کو حضرت موسیٰ کے طور پر جانے کا قصہ ملتا ہے، طور پر جاتے وقت حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل سے فرمایا تھا کہ ہماری واپسی تک یہیں ہمارا انتظار کرو،

وهنه ابرون وحور عاكم مي	اور دیکھو ہارون و حور تمھارے ساتھ ہیں
بعل دبريم يجش اليهم	اور تم میں سے کسی کو کچھ کہنا ہو تو ان کے پاس
(خروج ۲۴: ۱۴)	آئے،

قرآن مجید قصہ کے اس حصہ کی تصدیق نہیں کرتا، قرآن کے بیان کے مطابق

قال موسىٰ لاخيه هارون اخلفني	موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا میری
في قومي واصلح ولا تتبع سبيل المفسدين	قوم میں میری نیابت کرنا اور حالت
(۱۶ اعراف)	سدھارتے رہنا اور مفسدوں کی راہ نہ چلنا

لیکن سفر خروج کا جامع اس بات پر یقین کامل رکھتا تھا کہ حضرت موسیٰ نے حضرت ہارونؑ کے علاوہ ایک اور شخص کو بھی اپنا جانشین بنایا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ اگلے بیان کے مطابق بعد کے قصہ سے اس حور کا بھی ضرور تعلق تھا، لیکن کسی خاص وجہ سے اس کے نام کو بعد میں بالکل حذف کر دیا گیا ہے،

قصہ کے ربط کے لحاظ سے جو چوبیسویں باب کے عین بعد بتیسویں باب کو ہونا چاہئیے، ان دونوں بابوں کے درمیان ایک ایسے ماجرا کو رکھ دیا گیا ہے جس کا تعلق نہ تو بظاہر ماجرائے طور سے ہے اور نہ گوسالہ پرستی سے اور نہ اس باب کے احکام کا زمانہ وہ باور کیا جاسکتا جو حضرت موسیٰؑ کے طور پر جانے کے بعد عین گذرا، اگر اس بے تعلق باب کو ہم باب ۳۴ کے بعد کر دیں تو ایک طرف یہ قصہ مربوط ہو جائے گا اور دوسری طرف باب ۲۵ تا ۳۱ اپنے سلسلۂ بیان سے ملحق ہو جائے گا، اور سفر خروج کے جامع کا بیان یوں ہو جائے گا،

اور خداوند نے موسیٰ کو کہا کہ میرے پاس پہاڑ پر آ ۔ ۔ ۔ اور موسیٰ خدا کے پہاڑ پر گیا اور وہ بزرگوں سے کہہ گیا کہ جب تک ہم آنہ جائیں یہیں ٹھہرو اور دیکھو ہارون و حور تمہارے ساتھ ہیں، اگر کسی کو کچھ کہنا ہو تو ان کے پاس جائے، (خروج ۲۴: ۱۲ تا ۱۴)

اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ پر سے اترنے میں دیر کی تو وے سب (××) کے پاس جمع ہوئے اور کہنے لگے کہ اٹھ اور ہمارے لئے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے آگے چلیں

(خروج ۳۲: ۱)

فرض کرو کہ جس جگہ ہم نے دو چلیپائیں رکھی ہیں، وہاں کے الفاظ واقعی دیمک چاٹ گئی ہے، اور اب ہم کو عقل سے اس کی خانہ پری کرنی ہے، تو اس جگہ ہم حور وہارون دو میں سے ایک کا نام فرض کرنے پر مجبور ہیں، دونوں کا اس لئے نہیں کہ انھوں نے کہا تھا "تو اٹھ" یعنی اور یہ بات شخص واحد ہی سے کہی جاسکتی ہے، یہاں جس کا بھی نام رکھو اس نے لوگوں سے کچھ زیورات لئے، اور

"ایک بچھڑا ڈھال کر اس کی صورت ٹانکی سے درست کی" (۳۲: ۴) اور ×× نے یہ کہہ کر منادی کی کہ کل خداوند کی عید ہے، (۳۲: ۵)

تب خدا نے موسیٰ سے کہا کہ اتر جا کیونکہ تیرے لوگ جنھیں تو مصر کے ملک سے چھڑا لایا ہے، خراب ہو گئے ہیں (۳۲: ۷) انھوں نے اپنے لئے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور پوجا (۳۲: ۸) اور موسیٰ پہاڑ پر سے اترا (۳۲: ۷) اور اس نے بچھڑے کو جسے انھوں نے بنایا تھا لیا اور اس کو آگ سے جلایا (۳۲: ۲) اور موسیٰ نے دیکھا لوگ بے قید ہو گئے ہیں، اور ہارون نے ان کو ان کے مخالفوں کے آگے رسوا ہونے کیلئے بے قید چھوڑ دیا ہے، تو لشکرگاہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی کہ جو خداوند کی طرف ہو سو میرے پاس آوے، تب سب بنی لاوی اس پاس جمع ہوئے، اور اس نے انھیں کہا کہ خداوند خدائے اسرائیل نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر ایک اپنی کمر میں تلوار باندھے اور ایک دروازے سے دوسرے دروازے سے تمام لشکرگاہ میں گذرے اور ہر مرد اپنے بھائی اور اپنے آدمی اور اپنے دوست اور اپنے قریب کو قتل کرے اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے مطابق کیا، اور اس دن لوگوں میں سے تین ہزار کے قریب مرد مارے گئے (۳۲: ۲۵ تا ۲۸)

اس عبارت کو نقل کرتے وقت ہم نے اس سوال وجواب کو حذف کر دیا ہے جو گوسالہ بنا دینے والے مجرم اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان ہوا تھا، کیونکہ قرآن کریم نے اس سوال جواب میں بھی ترمیم کی ہے جس کے ذکر کا یہ موقع نہیں، تو آئیے اس بیان کو غور سے پڑھو، جامع خروج کے بیان کے مطابق

(۱) حضرت موسیٰؑ نے دو جانشین مقرر کئے تھے ہارونؑ اور حور،

(۲) ان میں سے ایک نے قوم کی درخواست پر بچھڑا بنا دیا اور اس کی پرستش کی عید کا اعلان کر دیا،

(۳) ایک کے اوپر یہ الزام ہے کہ اس نے قوم کو بے قید چھوڑ دیا،

ظاہر ہے کہ یہ دونوں الزام ایک شخص پر نہیں ہو سکتے، جس نے بے قید چھوڑا وہ حضرت ہارونؑ تھے، یہی ان کی وہ خطا تھی جس کی بنا پر سفر تثنیہ کے مطابق خدا ان پر بھی ناراض ہوا تھا، دوسرے کو یقیناً حور ہونا چاہئے، اگر حضرت ہارونؑ وہ مجرم ہوتے جس نے بچھوا پوجوایا تھا تو وہ ان تین ہزار مقتولوں میں سے ہوتے جن کو بنی لاوی نے قتل کیا، برخلاف اس کے وہ نہ صرف زندہ رہے بلکہ ان کو زندگی بھر موسیٰ علیہ السلام کے برابر تقدس حاصل رہا، خدا نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا تھا کہ

"جس نے میری خطا کی اس کا نام کتاب سے میٹ دونگا" (۳۲: ۳۳)

حضرت ہارونؑ کا نام کتاب ابرار سے مٹا نہیں گیا بلکہ بعد کے تمام انبیاءؑ نے ان کی عزت کی، اس لئے یقینی امر ہے کہ جامع خروج نے بچھوا بنا دیکر اسے پوجوانے کا الزام حضرت ہارونؑ پر نہیں بلکہ حور پر لگایا تھا،

سفر خروج کے جامع نے اس حور کا نسب نامہ نہیں بتایا ہے، لیکن باب ۲۴ اور باب ۳۲ کے درمیان بے ربط طور پر جس نے باب ۲۵ لغایۃ باب ۳۱ کو رکھ دیا ہے اس کا منشا یہی بتانا تھا کہ یہ حور وہی ہے جس کے پوتے بضلی ایل بن اوری بن حور کا ذکر ایک نہایت ماہر عجیب حکمت کے کام کرنے والے سنار کی حیثیت سے آیا ہے، حضرت یوشع بن نون بن الیشمع کے دادا الیشمع جب حضرت موسیٰؑ کے مصر سے خروج کے وقت زندہ تھے، تو بضلی ایل کے دادا کا زندہ رہنا تعجبات سے نہیں ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ حور جسے بضلی ایل کا دادا کہا جاتا تھا وہ حضرت موسیٰؑ سے تقریباً دو سو برس پہلے گذرا، حضرت موسیٰؑ اسے اپنا جانشین نہیں قرار دے سکتے تھے، غالباً اسی بنا پر خروج باب ۳۲ میں حور کے نام کو کاٹ کر حضرت ہارونؑ کا نام رکھ دیا گیا، محرف نے اس جگہ دست درازی تو کر دی مگر

ستر ہویں اور چوبیسویں باب پر اس کی نظر نہیں پڑی،

سرسری نظر رکھنے والے قرآن اور بائبل میں اس جگہ یہی فرق پاتے ہیں کہ خروج کے مولف نے بچھوا پوجوانے کا الزام حضرت ہارونؑ پر لگایا، قرآن اس کی تردید کرتا ہے، لیکن جس تحریف نے حضرت ہارونؑ کو مجرم بنایا ہے وہ غالباً اتنی قدیم نہیں ہے کہ اسے قرآن کی کسی آیت کا سبب نزول قرار دیا جا سکے، سفر خروج کے مولف نے ہارون علیہ السلام پر نہیں بلکہ حور پر یہ الزام لگایا تھا جو اس کے بیان کے مطابق حضرت ہارونؑ کی طرح حضرت موسیٰؑ کے ایک نائب تھے، قرآن کریم میں خدا نے سفر خروج کی اس روایت کو یہ بتا کر جھٹلایا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے صرف اپنے بھائی ہارونؑ کو خلیفہ بنایا تھا،

سفر ہوشیع | حضرت سلیمانؑ کے مرنے کے بعد بنی اسرائیل کے دس قبائل نے مرتد ہو کر گوسالہ پرستی اختیار کر لی اور ریبعام کو اپنا بادشاہ مقرر کیا، یربعام کی قائم کی ہوئی حکومت کے ایک فرماں روا عمری نے اپنا پایہ تخت ایک پہاڑ پر بنا کر اس کا نام شمرون رکھا، اس وقت سے یہوداہ اور شمرون یا بالفاظ دیگر یہودی اور سامری دو مذہبی نام ہو گئے، لفظ سامری کی تحقیق آگے آتی ہے، سامریوں کے درمیان جن بزرگوں نے توحید کی بار بار تبلیغ کی ان میں سے ایک بزرگ جناب ہوشیع تھے وہ اپنے صحیفہ میں فرماتے ہیں،

زانخ عجلک شمرون حرا انی — اے شمرون تیرے بچھوے نفرت خیز ہیں،
بام (۸: ۵) شبیبم یہیہ عجل شمرون — ان پر میرا غضب بھڑکا ہے، شمرون کے
(۸: ۶) کی نعمی لشرئیل واجبیہو — بچھڑے ٹکڑے کئے جائیں گے اسرائیل جب
ہمصدیم قراتی للبنی (۱۱: ۱) — لڑکا تھا میں نے اسے چاہا اور اپنے بیٹے
و بلبی ہعلہ یہوہ ابت لیشرئیل ہمقو — کی طرح اسے مصر سے بلایا، ایک نبی کے ذریعہ خدا نے

ومبنی تشمر (۱۳:۱۲) ہکیم افرایم	اسے مصر سے نکال لایا، اور ایک نبی
تمرورِیم و دمایو علاو یطش	کی بدولت وہ محفوظ رہا، افرایم نے بہت
وحرفتو لو ادونو (۱۵:۱۲)	کام کیے، اس کا خون اسی پر ہوگا، اس کی
کدبر افرایم رتت نشأ ہوا	گرنی اس کا خدا اسی پر لوٹائے گا جب ہی
بیشرائیل ویاشم ببعل ویمت	افرایم بولا (زمین) لرزی کیونکہ وہ اسرائیل
ویوسفو لحطا ویعشو لہم مسکہ	کا سردار تھا مگر بعل کی بدولت گنہگار ہوا
کسپام عصبیم	وہ خطاکاری میں بڑھتے ہیں اور اپنے
معشہ حراشیم کلہ لہم	لئے اپنی چاندی سے ڈھلی ہوئی مورت
ہم امریم زبحی آدم	بناتے ہیں، اپنی فہم کے مطابق بت
یشقون	بناتے ہیں، جو سب کے سب ان کی دستکاریاں
(۲:۱۳)	ہیں، کہتے ہیں کہ قربانی کرنے والے
	لوگ بچھڑے کو چومیں،

اس بیان کے مطابق وہ شخص جس کے اوپر عہد موسوی میں بنی اسرائیل سے گوسالہ پوجوانے کا الزام عائد ہوتا ہے، افرایم بن یوسف کی نسل سے تھا، یہ بیان نہ حور پر صادق آتا ہے جو بنی یہوداہ میں سے تھا اور نہ حضرت ہارونؑ پر، واقعہ یہ ہے کہ جس طرح سفر خروج میں اس کے مولف کی مرضی کے خلاف حضرت ہارونؑ کا نام بعد میں رکھا گیا، اسی طرح اس موقع پر افرایم کا نام بھی غلط ہے، بنی افرایم یربعام کے زمانہ میں تو گمراہ ہوئے لیکن حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں قطعی طور پر راہ راست پر رہے، حضرت موسیٰؑ کے بعد ان کی خلافت بنی افرایم ہی کے رئیس حضرت یوشع بن نون کو ملی تھی، جس کے معنی یہ ہیں

کہ قیادت اقوام کے حق دار اپنے فضائل کی بنا پر ان دونوں بنو افرایم تھے، اسی لئے حضرت موسیٰؑ نے مرتے وقت بنی یوسف کے حق میں فرمایا،

بکور شورو ہدار لو وقرنی	اس کی شانداری اس کے پہلے سانڈ کی
رام قرنایو بہم عمیم	سی ہے اس کے سینگ گینڈے کے سے
ینگح یحداو افسی ارص وہم	ہیں وہ ان کی قوموں کو ریلے گا ایک
ربیوت افرایم وہم الفی	ساتھ انتہائی زمین تک اور دس ہزار
منشی (تثنیہ ۳۳:۱۷)	افرایم اور ہزاروں منسی ہیں،

قرآن مجید میں خدا نے گوسالہ پوجوانے والے کو السامری کا لقب دے کر حور، ہارونؑ، اور افرایم کے رئیس تینوں پر سے الزام دفع کر دیا ہے،

زبور عہد موسیٰ کی گوسالہ پرستی کا ذکر ایک زبور میں بھی ہے، یہ حضرت داؤد کی زبور نہیں بلکہ کسی نامعلوم بزرگ کا ہے، جو اسیران بابل میں سے ایک تھا، (۱۰۶: ۴۷) اس زبور کا مولف لکھتا ہے

ہمارے باپ دادا نے مصر میں تیری عجیب قدرتوں کو نہیں سمجھا، انھوں نے تیری رحمتوں کی بہتات کو یاد نہیں کیا،

ویمرو عل یم بیم سوف	بلکہ سمندر پر لال سمندر پر بغاوت کی،

لیکن اس نے اپنے نام کی خاطر انھیں بچایا تاکہ اس کی قدرت ظاہر ہو اور اس نے لال سمندر کو ڈانٹا اور وہ خشک ہو گیا،

ویولیکم بتہوموت کمدبر	اور انکو گہراؤ میں سے گذار لے گیا جیسے بیابان میں سے

اس نے ان کو بدخواہوں کے ہاتھ سے اور دشمنوں کے قبضہ سے چھڑایا،

عبرانی	ترجمہ
وبنيء تشمر (۱۲:۱۲) هكيعم افرايم	اسے مصر سے نکال لایا، اور ایک نبی
تمرو ريبو ددمايو علاد يو يطش	کی بدولت وہ محفوظ رہا، افرایم نے بڑے
وحرفتو يواد وغالو (۱۲:۱۵)	کام کیے، اس کا خون اسی پر ہو گا، اس کی
كدبر افرايم رتت نشا أهوا	کرنی اس کا خدا اس پر لوٹائے گا، جب بھی
بيشرائيل ويا ببعل ويت	افرایم بولا (زمین) لرزی کیونکہ وہ بنی اسرائیل
يوسفو لحطاو يعشو لهم مسكه	کا سردار تھا، مگر بعل کی بدولت گناہ گار ہوا
كتبو نا م عصبيه	وہ خطاکاری میں بڑھتے ہیں اور اپنے
معشه حراشم كلهم	لئے اپنی چاندی سے ڈھلی ہوئی مورت
هم امريم زبحي آدم	بناتے ہیں، اپنی فہم کے مطابق بت
يشقون	بناتے ہیں، جو سب کے سب ان کی دستکاریاں
(۱۳:۲)	ہیں، کہتے ہیں کہ قربانی کرنے والے
	لوگ بچھڑے کو چومیں،

اس بیان کے مطابق وہ شخص جس کے اوپر عہد موسیٰ میں بنی اسرائیل سے گوسالہ پوجوانے کا الزام عائد ہوتا ہے، افرایم بن یوسف کی نسل سے تھا، یہ بیان نہ خود پر صادق آتا ہے جو بنی یہوداہ میں سے تھا اور نہ حضرت ہارونؑ پر، واقعہ یہ ہے کہ جس طرح سفر خروج میں اس کے مولف کی مرضی کے خلاف حضرت ہارونؑ کا نام بعد میں رکھا گیا، اسی طرح اس موقع پر افرایم کا نام بھی غلط ہے، بنی افرایم یربعام کے زمانہ میں تو گمراہ ہوئے لیکن حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں قطعی طور پر راہ راست پر رہے، حضرت موسیٰؑ کے بعد ان کی خلافت بنی افرایم ہی کے رئیس حضرت یوشع بن نون کو ملی تھی، جس کے معنی یہ ہیں

کہ قیادت اقوام کے حق دار اپنے فضائل کی بنا پر ان دونوں بنو افرایم تھے، اسی لئے حضرت موسیٰؑ نے مرتے وقت بنی یوسف کے حق میں فرمایا،

عبرانی	ترجمہ
بكور شورو هدر لو وقرني	اس کی شانداری اس کے پہلوٹھے سانڈ کی
رام قرني بهم عميم	سی ہے اس کے سینگ گینڈے کے سے
ينجح يحدو افسي ارص وهم	ہیں وہ ان کی قوموں کو زمین کے سب
ربوت افرايم وهم الفي	ساتھ انتہائی زمین تک اور دس ہزار
منشي (تثنیہ ۱۷:۳۳)	افرایم اور ہزاروں (بنو) منسی ہیں،

قرآن مجید میں خدا نے گوسالہ پوجوانے والے کو السامری کا لقب دے کر خود ہارونؑ، اور افرایم کے رئیس تینوں پر سے الزام دفع کر دیا ہے،

زبور | عہد موسیٰ کی گوسالہ پرستی کا ذکر ایک زبور میں بھی ہے، یہ حضرت داؤد کی نہیں بلکہ کسی نامعلوم بزرگ کا ہے، جو اسیران بابل میں سے ایک تھا، (۱۰۶:۶-۲۷) اس زبور کا مولف لکھتا ہے

ہمارے باپ دادا نے مصر میں تیری عجیب قدرتوں کو نہیں سمجھا انھوں نے تیری رحمتوں کی بہتات کو یاد نہیں کیا،

عبرانی	ترجمہ
ويمرو عل يم بيم سوف	بلکہ سمندر پر لال سمندر پر بغاوت کی،

لیکن اس نے اپنے نام کی خاطر انھیں بچایا تاکہ اس کی قدرت ظاہر ہو اور اس نے لال سمندر کو ڈانٹا اور وہ خشک ہو گیا،

عبرانی	ترجمہ
ويوليكم بتهوموت كمدبر	اور انکو گہراؤ میں کے اندر جنگل میں سے چلایا

اس نے ان کو بدخواہوں کے ہاتھ سے اور دشمنوں کے قبضہ سے چھڑایا

اور پانیوں نے ان کے بیڑوں کو غرقاب کر لیا جن میں سے ایک نہیں بچا تب وہ اس پر
ایمان لائے اور اس کی حمد و ثنا گانے لگے مگر جلد اس کے کاموں کو بھول گئے، اور اس کی
نصیحت کا انتظار نہیں کیا، انھوں نے حرص کا مظاہرہ کیا اور بیابان میں خدا کو آزمایا،
اس نے ان کا مطلب پورا کر دیا، مگر ان کی جانوں پر لاغری بھیجی.
انھوں نے خیمہ گاہ میں موسیٰ پر اور خداوند کے قدوس ہارون پر حسد کیا، پھر زمین پھٹی اور اس نے
داتن کو نگل لیا اور ابرام کے گروہ کو ڈھانپ لیا، ان کی جماعت میں آگ بھڑکی
جس کے شعلوں نے شریروں کو بھسم کر دیا،

بعشو عجل بحورب وشتحو — انھوں نے حورب میں بچھڑا بنایا اور ڈھالی
وجبیروات کبودام بتبنیت شود — ہوئی مورت کو سجدہ کیا اور اپنی شوکت
اُکل عشب (۱۰۶: ۱۹، ۲۰) — کو بیل کی مورت سے جو گھاس کھاتا ہے،

اس زبور کے مولف کا خیال یہ تھا کہ داتن اور ابرام کے ہم مسلک اور ان کی جماعت
کے لوگ باغی تھے جنھوں نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے خلاف حسد اور ان کی روز افزوں
عظمت سے چڑھ کر بغاوت کی تھی اور ان ہی باغیوں نے گوسالہ بنایا تھا، اس زبور سے
صاف ظاہر ہے کہ گوسالہ بنا دینے کا الزام سنہ ۵۰۰ ق م تک حضرت ہارونؑ پر نہیں تھا،

سفر عدد اس زبور میں جس بغاوت کا ذکر ہے اس کا تذکرہ سفر عدد میں بھی ہے، سفر عدد
کو حضرت موسیٰؑ کی کتاب کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں عہد موسیٰ کے احوال ہیں، لیکن اس کا
مولف بہت بعد کا آدمی ہے، محققین کے نزدیک یہ متعدد کتابوں سے التقاط کر کے لکھی
گئی ہے، خود اس کتاب کے اندر ایک قدیم کتاب "جنگ نامہ خداوند" کا حوالہ آیا ہے (عدد ۲۱: ۱۴)
یہ کتاب زبور ۱۰۶ کے برابر قدیم نہیں ہے، اور نہ اس کے برابر قابل اعتماد ہے، صاحب زبور

نے اس بغاوت کا زمانہ بنی اسرائیل کے سمندر پار کرنے کے وقت بتایا ہے، سفر عدد کے مولف
نے اس کا زمانہ سنہ ۲ خروج کو قرار دیا ہے، اس کا بیان ہے کہ جن دنوں حضرت موسیٰ نے
عمالقہ کے ساتھ جنگ کا حکم دیا

سارے گروہ نے اپنی آواز بلند کی اور سب لوگ چلانے اور رونے لگے، سارے فرزندانِ
اسرائیل نے موسیٰ اور ہارون کے خلاف بڑبڑانا شروع کیا، اور ایک دوسرے سے کہا کہ
خدا کرتا ہم مصر ہی میں مر گئے ہوتے مصر میں نہیں تو بیابان ہی میں فنا ہو گئے ہوتے اور
انھوں نے آپس میں رائے کی اور ایک دوسرے سے کہا کہ آؤ ہم ایک کو "راش" (سردار)
مقرر کریں اور مصر کو لوٹ چلیں، (عدد ۱۴: ۱-۴)

سفر نحمیاہ سفر عدد کے مولف کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس مشورہ پر بنی اسرائیل کے کسی
حصہ نے عمل کیا یا نہیں، اس کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ، حضرت ہارونؑ اور حضرت یوشعؑ
ابن نون نے خوشامد کر کے لوگوں کا غصہ دھیما کر دیا، لیکن سفر نحمیاہ میں ہے کہ

ان لوگوں نے اپنی گردنیں سخت کیں، اور اپنی سرکشی سے انھوں نے ایک کو اپنا سردار
مقرر کیا تاکہ اپنی بندگی میں لوٹ جائیں" (نحمیاہ ۹: ۱۷)

حاصل کلام سفر عدد، سفر نحمیاہ، زبور اور اعمال کے مشترک بیانوں کا خلاصہ یہ ہے کہ
بنو اسرائیل نے ایک وقت حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے خلاف سرکشی کر کے ایک
تیسرے شخص کو اپنا رئیس بنایا، یہ واقعہ سفر عدد کے بیان کے مطابق خروج سے ۲ برس بعد
کا ہے، مگر زبور کے بیان کے مطابق یہ بغاوت بحر قلزم کے کنارے گوسالہ پرستی کے
واقعہ سے پہلے کا ماجرا ہے،

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دو حیثیتیں تھیں، ایک حیثیت یہ تھی کہ وہ خدا کے رسول

تھے، دوسری حیثیت یہ تھی کہ وہ یسوروں میں بادشاہ تھے" (تثنیہ ۳۳: ۵) پہلی حیثیت کے لحاظ سے ان پر ان کی قوم کے صرف چند لڑکے ایمان لائے تھے، (یونس ۹: ۱) دوسری حیثیت پر اس بغاوت کے وقت تک سب کا اتفاق تھا، فرعون سے نجات پانے کے بعد عوام نے ان کی اس حیثیت سے بھی انکار کر دیا، اور انھوں نے ایک اور شخص کو اپنا سردار مقرر کر لیا یہی سردار قرآن کا السامری ہے،

"السامری" نام نہیں بلکہ نسبت ہے بعض لوگ اپنے نام سے نہیں بلکہ اپنے نسبی لقب سے مشہور ہوتے ہیں، قرآن پر اعتراض کرنے والے بعض مدعیان علم کا دعویٰ ہے کہ عہد موسیٰ میں کوئی سامری تھا ہی نہیں، بنو اسرائیل کا ایک طبقہ حضرت سلیمانؑ کے بعد سے سامری کہلانے لگا، لیکن اس ادعا میں صرف بے جا تعصب نظر آتا ہے،

السامری یائے نسبت اور لام تعریف کے اضافہ کے ساتھ عبرانی (شومر، پاسبان) کی تعریب ہے، حضرت موسیٰؑ سے پہلے بنی یعقوب میں شومر (پاسبان قوم) کہلانے والے کئی افراد گذرے ہیں، جن میں سے ہر ایک کی نسل کا ہر فرد السامری کہلا سکتا تھا، خود عہد موسیٰ میں بھی ایک شخص ایسا تھا جو شمری کہلاتا تھا اگرچہ اس کا اس نام سے قصۂ موسیٰ میں ذکر نہیں ملتا ہے لیکن نسب نامہ پشتیں اس کا وہی زمانہ مقرر کرتی ہیں، جو حضرت موسیٰؑ کا زمانہ ہے، ذیل میں سفر ایام سے چند اہم فرزندان اسرائیل کا شجرۂ نسب نقل کیا جاتا ہے، یہ شجرہ نسب قرآن کے السامری کو نہایت آسانی سے پہچنوا دے گا

شمرون [illegible] [illegible] شاؤل بن حصرونا افرائیم ۱ سنہ

شومر اہود موشی شلوم کالب رام برحم ایل × ۵۰ سنہ

یحرم محلی بلشام حور اونام تلح ۱۰۰ سنہ

الفعلی شومر مشع سمی تمن ۱۵۰ سنہ

شومر حموایل ندب المعدران ۲۰۰ سنہ

ذکور افائیم عیمہود ۲۵۰ سنہ

سمی اوری عمی ندب لسی الیشمع ۳۰۰ سنہ

شمری بضلی ایل نحشون بیسان نون ۳۵۰ سنہ

سلمون نحلی یوشع

پہلی سطر میں ایسے افراد کے نام ہیں جو سلسلہ دخول یعنی ۴۳۰ سنہ قبل خروج سے پہلے پیدا ہو چکے تھے، نویں سطر میں حضرت موسیٰؑ کے معاصرین کا نام ہے، اس سطر کے سامنے حضرت موسیٰؑ کا سال ولادت لکھا ہوا ہے، افرائیم و تلح کے درمیان ایک پشت کی جگہ ہم نے اس لئے خالی رکھی ہے کہ جناب تلح جناب افرائیم کے بیٹے ہونے کے باوجود ان کے پوتوں بلکہ پرپوتوں کے ہم عمر تھے، اوری اور حور کے درمیان دو نام اور عمی ندب اور رام کے درمیان تین نام کی جگہ دوسرے نسب ناموں کا مقابلہ خالی رکھنے پر مجبور کرتا ہے،

اس نسب نامہ میں آپ کو ایک شمرون، تین شومر اور ایک شومری یا قرآنی لفظوں میں السامری ملتا ہے، یہ شخص حضرت موسیٰؑ اور نون بن الیشمع کا ہم پشت ہے، قرآن مجید نے اسی شخص کو اس جرم کا مرتکب بتایا ہے، جسے سفر خروج کے مولف نے حور نام ایک شخص کا جرم بتایا تھا، پھر ایک تحریف نے اس حور کو حورین کالب بنا دیا، پھر دوبارہ تحریف نے اس کے نام کو حضرت ہارونؑ کے نام سے بدل دیا، ممکن ہے کہ اس السامری کا بھی حور ہی نام رہا ہو، قرآن مجید کے اندر جس شخص کا ذکر السامری کے نام سے اس کے خاندان کو پہچاننے کی

ایک صورت عہد موسیٰ کی دو مردم شماریوں پر غور کرنا ہے،

حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں بنو لاوی کو چھوڑ کر باقی اسباط کی دو بار مردم شماری ہوئی تھی، ایک بار خروج سے کچھ دنوں بعد ہی ہوئی تھی، اس وقت کی مجموعی تعداد ۶ لاکھ تین ہزار پانچسو تھی اور دوسری مردم شماری اس وبا کے بعد ہوئی جو بعل پرستی کی بنا پر خدا نے بنی اسرائیل میں بھیجی تھی، اس بار کی مجموعی تعداد چھ لاکھ ایک ہزار سات سو ثابت ہوئی، اس وبا میں کئی قبیلوں کی تعداد...... بہت گھٹ گئی، اور کئی قبیلوں کی تعداد میں اس وبا کے باوجود اضافہ ہوگیا، تفصیل اس کمی اور بیشی کی قابل غور ہے،

نام قبیلہ	پہلی تعداد	دوسری تعداد	گھٹے	بڑھے
شمعون	۵۹۳۰۰	۲۲۲۰۰	۳۷۱۰۰	۰
نفتالی	۵۳۴۰۰	۴۵۴۰۰	۸۰۰۰	۰
افرائیم	۴۰۵۰۰	۳۲۲۰۰	۸۰۰۰	۰
جد	۴۵۶۰۰	۴۰۵۰۰	۵۱۰۰	۰
روبن	۴۶۵۰۰	۴۳۷۰۰	۲۸۰۰	۰
دان	۶۲۷۰۰	۶۴۴۰۰	۰	۱۷۰۰
یہوداہ	۷۴۶۰۰	۷۶۵۰۰	۰	۱۹۰۰
زبولون	۵۷۴۰۰	۶۰۵۰۰	۰	۳۱۰۰
اشکار	۵۴۴۰۰	۶۴۳۰۰	۰	۹۹۰۰
بنیامین	۳۵۴۰۰	۴۵۵۰۰	۰	۱۰۲۰۰
منشی	۳۲۲۰۰	۵۲۷۰۰	۰	۲۰۵۰۰

آپ نے دیکھا کہ جس خاندان میں ہم کو السامری ملتا ہے سب سے زیادہ سخت سزا شرک و بت پرستی کی اس مردم شماری کے مطابق اسی خاندان کو ملی،

زمری بن سلو جس نے کزبی بنت صور سے نکاح کرکے بعل پرستی کو رواج دیا تھا اور جس کے مارے جانے کے بعد وبا کو خدا نے دفع کیا اسی خاندان بنی شمعون کا فرد تھا جس کے اندر ہم کو حضرت موسیٰؑ اور حضرت نونؑ کی پیڑھی میں شومری ملتا ہے،

حاصل کلام یہ ہے کہ جس شخص نے بنی اسرائیل سے بچھوے کی مورت بنوائی تھی سفر یشوع کے اشارہ کے مطابق وہ بنو افرائیم میں سے تھا سفر خروج قبل تحریف کے مطابق وہ حور نامی ایک شخص تھا جسے تحریف اول نے فرزند کالب سے تطبیق دلائی پھر اس کا نام کٹوا کر ہارون علیہ السلام کا نام رکھ دیا ہے،

حور کا گناہ ہارون کے نامۂ اعمال میں جس وجہ سے لکھا گیا وہ یہ ہے کہ حور بن کالب کو اور سلمان بن حور کو بیت اللحم کا باپ بھی کہا جاتا تھا (ایام ۲: ۵۱ و ۴: ۴) حور کا نام اگرچہ آبائی نسب نامۂ مسیح و داود میں داخل نہیں لیکن باشندگان بیت اللحم کا نسب نامہ کسی نہ کسی طرح حور بن کالب پر ضرور منتہی ہوتا تھا، نسب نامۂ مسیح کی تطہیر کے لئے نصرانیوں نے حور کو مورث مسیح سمجھ کر اس کے نام کی جگہ حضرت ہارونؑ کا نام رکھ دیا ہے، ورنہ دراصل خروج ۳۲: ۲۱ میں حور ساھری کا نام تھا، جو بنی شمعون میں سے تھا،

ضمیمہ مضمون گجرات کے کتب خانے

از

جناب قاضی سید نور الدین حسین بھروچ

گذشتہ فروری و مارچ کے معارف میں جناب مولنا سید ابوظفر ندوی صاحب کا مضمون "ہندوستان کے کتب خانے" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اس میں گجرات کے کتب خانوں کے حالات میں چند نامی کتب خانوں اور کتابوں کے حالات کے اضافہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، یہ مضمون اسی کا تکملہ ہے،

سیٹھ بھولاناتھ کا کتبخانہ سیٹھ بھولاناتھ احمد آباد کے باشندے اور شاہی متصدیوں میں تھے، جن کا کتبخانہ بھی مشہور تھا، اس کی چند قلمی کتابیں جو عرصہ سے احمد آباد کی بھولاناتھ لائبریری میں تھیں، وہ اب ورنا کیولر سوسائٹی میں منتقل کر دی گئی ہیں، راقم الحروف کو چند سال پہلے اس کتب خانے کو دیکھنے کا موقع ملا تھا، اس میں حسب ذیل کتابیں نادر قلمی موجود تھیں،

(۱) **تاریخ مظفر شاہی** مؤلفہ ملا لالی یہ نسخہ بڑودہ میں ۱۲۲۳ھ میں نقل کیا گیا ہے، مولانا سید ابو ظفر ندوی نے اس نسخہ کی نقل گجراتی ترجمہ کے ساتھ ورنا کیولر سوسائٹی کی جانب سے طبع کراکے شائع کی ہے،

(۲) **ایک فارسی کتاب** بطور دیوان "رپورٹ" احکام شاہی کے ہے، اور اس کے مؤلف کا نام نہیں تحریر ہے، اس میں ۱۱۲۲ھ تک کے گجرات کے انتظامات اور اہل حرفہ وغیرہ کے حالات ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ شاہی کتب خانے کا ہوگا، اس میں سلاطین گجرات کے عہد سے لیکر مغلیہ زمانہ تک کے حالات ہیں، خصوصیت کے ساتھ اہل حرفہ محکمہ قضات یعنی قاضی مفتی، قاضی القضاۃ، محتسب، فوجدار وغیرہ کی فہرست ان کے اور ان کے ماتحت ملازمین کے نام ان کی تنخواہوں وغیرہ کا مفصل ذکر ہے،

اسی قسم کی ایک کتاب مراۃ الہند بمبئی کی پٹٹ لائبریری میں بھی ہے جس کو محمد لطیف بن علی بن محمد شاہ صدیقی بھروچی نے ۱۱۵۷ھ میں مرتب کیا ہے، اس میں نظام حکومت، اسناد داروغگی، گرز بردار، دستور العمل فوجداری، دستور العمل پرگنات، دستور العمل کارکنی، دستور العمل فوطہ داری وغیرہ کے حالات تحریر ہیں، گجرات کے شہروں پرگنوں وغیرہ کی آمدنی کا بھی ذکر ہے،

(۳) **دیوان ولی**، یہ احمد آباد کے اردو کے مشہور شاعر، شاہ ولی اللہ المتخلص بہ ولی کے دیوان کا قلمی نسخہ ہے، اس میں ولی کے دو مشہور شاگرد رضی اور اشرف کا کلام بھی ہے،

محکمہ قضاۃ بھروچ کے کتبخانہ کی چند مزید قلمی کتابیں مولانا ابوظفر صاحب نے بھروچ کے محکمۂ قضاۃ کے جس کتب خانہ کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق راقم ہی سے ہے، اسکی چند مزید کتابوں کا نام لکھا جاتا ہے،

(۱) مبارق الازہار فی شرح مشارق الانوار ....

شارح عبد اللطیف بن عبد الملک المعروف بہ داور الملک متوفی ۹۱۵ھ (امیر کبیر سلطان محمود بیگڑہ) احمد آباد کے باشندے اور بڑے عالم و محدث تھے، انھوں نے احادیث کی شرح عربی میں لکھی ہے، حاشیہ میں احادیث کی تعداد معلوم کرنے کے لئے دائرہ بناکر صحیحین اور روایات کے لئے ہندسے لکھے ہیں، احمد آباد کے قاضی محمد صالح نے اس پر فارسی میں حاشیہ لکھا ہے، شرح کی ابتدائی عبارت یہ ہے،

"الحمد للہ علی ہدایت الاسلام وعطیۃ الدرایۃ والاعلام خصوصاً من بیان حدیث خیر الانام محمد المختص بمقام اعلی المقام ...... ویقول الفقیر الضعیف العویز عبد اللطیف بن عبد العزیز المعروف بابن الملک المحزون بحیف الفلک غفر اللہ لہ ولوالدیہ" الخ

(۲) نور القاری فی شرح البخاری

شارح علامہ نور الدین بن حاجی محمد صدیق احمد آبادی متوفی ۱۱۵۵ھ، ابتدائی عبارت یہ ہے،

"ہذا لتسمیۃ لیکون الکریم وحبیب الرحیم ولیعتد بہ شرعاً ولا یقطع برکتہ قطعاً...... وبہ قال مولانا مقبول عالم حدثنی مولانا خلیل محمد العباسی البنانی حدثنی عبد اللطیف حدثنی والدی عبد الملک حدثنی محمد المدعو بجار اللہ عن والدہ" الخ

(۳) **تفسیر شاہیہ**، مولفہ سید محمد مقبول عالم بن سید جلال الدین ابو محمد شاہ عالم الشاہی الرضوی، المتوفی ۱۱۱۱ھ، مؤلف نے فارسی میں یہ تفسیر لکھی ہے، اس میں اہل بیت علیہم السلام کی روایات کی تفسیر کی ہے، یاد ایام صت میں اسی تفسیر کا ذکر ہے، یہ کتاب تین جلدوں میں ہو جنمیں سے ایک کا پتہ نہیں چلتا، حاشیہ میں جا بجا تصحیح بھی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے قلم کا اصل مسودہ ہے،

(۴) **خزانۃ الروایات**، مولفہ قاضی جگن، کتابت ۱۰۳۳ھ،

(۵) **فتاوی حمادیہ**، مصنفہ مفتی رکن الدین ناگوری نہروالی، پرانا نسخہ ہے، آخر کے چند ورق غائب ہیں،

(۶) **مفاتیح الجنان شرح شرائع الاسلام**، شارح یعقوب بن سید علی، آخر کا ایک ورق ناتمام ہے،

(۷) **کتاب التق**، مصنفہ شیخ الاسلام ابو الحسن علی بن حسین،

(۸) **غرر الشروط و درر السموط**، مصنفہ شیخ حسن بن جعفر (بحث تفسیر النجم کے اخیر کے ورق ناتمام)

(۹) **زبدۃ القضا**، رسالہ در احکام قضاۃ وغیرہ کامل،

(۱۰) **مختار الاختیار**، مولفہ اختیار بن غیاث الدین الحسینی، فارسی میں احکام قضاۃ میں نایاب نسخہ ہے، کتابت ۱۱۱۱ھ، یہ کتاب مبحث و مقطفی میں منقسم ہے، پھر مبحث کو مجلس میں اور مجلس کو فصلوں میں تقسیم کیا ہے، ابتدا اس طرح ہے،

"خطبۃ الکتاب الکریم اختیار کل مختار و مختار کل اختیار ہو حمد علیم ...... و بعد فیقول العبد الفقیر الی اللہ الغنی اختیار بن غیاث الدین الحسینی ختم اللہ تعالی عواقبہ بالحسنی و بلغہ ما یبتغی" الخ

(۱۱) **نصاب الاحتساب**، مولفہ عمر بن محمد بن عوض، کتابت ۱۰۶۲ھ، کاتب کا نام عبد الملک ولد کریم محمد بن راجی محمد بن حسن محمد بھروچی کتاب کے سر ورق پر احمد عبد الملک صدیقی کی ۱۰۶۷ھ کی مہر ہے،

(۱۲) **نصاب الاحتساب**، عربی متن مع فارسی ترجمہ کے ہے، فارسی ترجمہ کا نام توریہ ہے، مترجم شیخ فتح اللہ معنون بہ نور محمد ہے، یہ کتاب اکبر آباد میں ۱۱۱۱ھ میں ختم ہوئی،

(۱۳) **دستور الاحتساب**، نصاب الاحتساب کا دوسرا ترجمہ ہے، مترجم کا نام خواجہ ابن احمد بن محمود ہے، فارسی ترجمہ سوال وجواب کے پیرایہ میں ہے، مترجم نے دیباچہ میں تحریر کیا ہے، کہ یہ ترجمہ اس نے سلطان مظفر[1] کی خدمت میں پیش کیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۱۷ھ میں پیش کیا ہوگا، دیباچہ میں ہے کہ

"میگوید بندہ حضرت معبود خواجہ بن احمد محمود کہ امر معروف ونہی از منکر کار انبیا را خدای تعالی بر امت محمد فرض گردانید از بہر ایشان مضمون مسائل نصاب الاحتساب پارسی ساختہ بحضرت مظفر شاہ گذرانیدم،

خدایا تا جہاں را باد شاہی — مظفر شاہ را دہ تاج شاہی
ز عدلش مملکت آباد گرداں — دلش از ہر چہ خواہد شاد گرداں
گلے آراستہ از بوستانش — نگہداری ز تاراج خزانش
ہر آنکہ بخت بد باشد ستیزد — چناں افتد کہ ہرگز بر نخیزد

---

[1] سلطان مظفر شاہ حلیم بن محمود شاہ سلطان گجرات،

ہمیشہ دولتش معمور بادا   معاندرا بما مقہور بادا

دبطریق سوال وجواب انجامیدم بنام دستور الاحتساب نامیدم وبجاے سوال اگر ترا

پرسند س، درضع کردم، وجواب بگو، ج "نہادم تا ہر یکے از پارسی بہرہ می گردد" الخ

آخر کے ایک دو ورق گم ہیں، کتاب پر احمد آباد کے قاضی القضاۃ قاضی نظام الدین خاں سنہ ۱۱۵۲ھ

کی مہر ہے،

(۱۴) **مجموعۃ الاصول**، جزاوّل ودوم وسوم، جزسوم کے دو نسخے ہیں، ایک نسخہ میں

ولد محمد عارف کے قلم کا سنہ ۱۰۹۴ھ کا لکھا ہوا ہے، اور دوسرے پر شہنشاہ عالمگیر کے عہد کے مفتی

وقاضی القضاۃ محی الدین بن عبدالوہاب کی مہر اور ان کے دستخط ہیں، دستخط کی عبارت یہ ہے،

"صاحبہ مالکہ شیخ محی الدین ابن اقضی القضاۃ قاضی عبدالوہاب صدیقی قدس اللہ روحہ"

(۱۵) **اشباہ والنظایر**، کتابت سنہ ۱۰۶۱ھ کاتب زین بن نجیم مصری[1] نے مؤلف کی اصل

کتاب سے اس کو نقل کیا ہے، اس کی عبارت یہ ہے،

"نقل ہذہ من نسخۃ المکتوبۃ من کتاب مولفہ الذی بیدہ المبارکۃ زین بن نجیم المصری

الحنفی غفر اللہ لہ ولجمیع المومنین . . . . . وقد کان الفراغ من کتابۃ ہذہ النسخۃ فی یوم اثنا

من شہر رجب المرجب فی التاریخ سبع وعشرین سنۃ الف واحد ستین، ملک میاں

شیخ عبدالوہاب مفتی ولد شیخ احمد ولد قدوۃ المحققین زبدۃ المتقین شیخ الاسلام مولانا

شیخ محمد طاہر الصدیقی الموروث الفتنی قدس اللہ روحہ العزیز"

[1] معارف :- زین بن نجیم مصری کاتب نہیں بلکہ اصل مصنف ہیں، وہ مشہور حنفی عالم اور الاشباہ والنظائر

فقہ میں ان کی مشہور ومعروف تالیف ہے جو چھپ کر شائع ہو چکی کاتب کی عبارت سے بھی ظاہر ہوتا

ہے کہ اس نے یہ نسخہ مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اصل نسخہ سے نقل کیا ہے۔

(۱۶) **رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمۃ**، مولفہ علامہ صدر الدین محمد بن عبدالرحمٰن

الحسینی القرشی العثمانی الشافعی، کتابت سنہ ۹۲۶ھ

(۱۷) **شرح فتوحات مکیہ المسمی بہ لسا فتوحات المکیۃ فی معرفۃ الاسرار المالکیۃ والملکیۃ** از شیخ

سید شریف شیخ بن عبداللہ العیدروس قدس سرہ متوفی سنہ ۹۹۰ھ، شرح کی جلد اول کے دو جزو

ہیں، دونوں کرم خوردہ ہیں، سرورق کئی جگہ سے پھٹ جانے سے پوری عبارت صحیح پڑھی نہیں

جاتی، وہ عبارت یہ ہے،

"عارف باللہ محی الدین محمد بن علی بن عربی نفع اللہ بہ وبعلوم . . . . . العلیۃ

ذوالکرامات . . . . . والمقامات السیر مولانا الشریف شیخ عبداللہ العیدروس نفع اللہ

بہ . . . . . اہل بیت النبوی جعفر بن جلال المقصود عالم الشاہی الرضوی"

کتاب پر احمد آباد کے شیخ محمد صالح بن نور الدین صدیقی کی سنہ ۱۱۴۶ھ کی مہر ہے، کتاب کے

آخر حصہ میں، الکتبہ ملوک اہل بیت النبوی جعفر بن جلال الدین محمد مقصود عالم الشاہی الرضوی

مرقوم ہے، دوسرے نسخہ کے صفحہ ۱۴۲ پر یہ عبارت ہے،

"وکان الفراغ من نساختہ ضحی یوم الخمیس ثانی یوم من ربیع الثانی سنۃ اربع وسبعین

وتسعمائۃ من الہجرۃ النبویۃ علی صاحبہا افضل الصلوٰۃ والسلام بخط اضعف عباد اللہ

وافقرہم واحوجہم الی کرمہ وعفوہ محمد بن عون بن محمد بن علی . . . . . غفر اللہ لہ ولوالدیہ

والمسلمین، آمین، (حاشیہ پر یہ عبارت ہے) بلغ المقابلۃ علی حسن الطاقۃ والامکان

علی ـــ السید الشیخ . . . . . العارف باللہ سیدی عبداللہ بن الشیخ العطف شیخ

ابن عبداللہ العیدروس والسید عبداللہ بن علوی ـــ الہادک ـــ بوسعد اللہ

علیہم، جمادی الثانی سنہ ۱۰۷۲ھ ہجریہ عبارت ہے، ہو تمت مطالعہ ۲۰ ذی القعدہ

کتبہ جعفر بن جلال الدین محمد مقصود عالم الشاہی الرضوی"

(۱۸) **عین الوفائی ترجمۃ الشفا**، یہ کتاب قاضی ابو الفضل عیاض بن موسیٰ بن عیاض متوفی ۵۴۴ھ کی مشہور سیرۃ النبی کا فارسی ترجمہ ہے، جس کو مترجم ابوبکر بن احمد بھروچی نے خود مصنف کے ایماء سے کیا تھا، اس پر قاضی محمد صالح احمد آبادی کی ۱۳۲۹ھ کی مہر ہے،

(۱۹) **لطائف شاہیہ** (اوراد) مؤلفہ سید محمد بن سید جلال الشاہی رضوی متوفی ۱۰۴۵ھ یہ کتاب ۳۴ بابوں میں منقسم ہے، جو لطیفہ سے منسوب ہے، مولف رسالہ دیباچہ میں

"و جمع این لطائف و وظائف تبرکاً بحساب سنین عمر مبارک حضرت خاتم صلی اللہ علیہ وسلم و تیمناً بشمار سالہائے حیات صوری شاہ عالم و رشصت و سہ لطیفہ دارد و بہ الاستعانۃ والاستمداد فی العمل والاعتقاد۔ الخ فہرست لطائف، لطیفہ اولیٰ در نیقظ، دوم در استعداد، سوم در طہارت، چہارم در لباس، پنجم در ذکر سحر، ششم در استماع اذان، ہفتم در سعی بہ مسجد، ہشتم در نماز فجر، نہم در ورد فجر، دہم در اذکار فاتحہ یازدہم در دعائے استعانۃ، دوازدہم در ذکر کشف سیزدہم در قرأت آیات، چہاردہم در اذکارے کہ بعد از فریضہ وارد است، پانزدہم در اذکار اربع الٰہیہ، ہفدہم کلمات ثلاث ساعیہ، ہژدہم در پنج گنج اول، نوزدہم در پنج گنج آخر، بستم در قرأت سورۂ فاتحہ وغیرہ"

یہ نسخہ خوشخط ہے لیکن چند اوراق گم ہیں، مگر اسی رسالہ کا دوسرا کامل نسخہ راقم الحروف کے جد حضرت قاضی سید احمد حسین بن سید محمد کے قلم خط کا ہی، جو کسی کامل نسخہ کی نقل ہی،

(۲۰) **اعمال و اشغال فوائد**، مرتبہ سید جعفر بدر عالم بن سید جلال مقصود عالم منقول از نقل بدر عالم، رسالہ کے اخیر ورق پر "مقابلہ و تصحیح کردہ شدہ ۱۱۶۵ھ میں" لکھا، "حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت، اور حضرت قطب عالم قدس سرہما کے اقوال و اوراد

کو جمع کیا ہے،

(۲۱) **خلاصۃ الارشاد**، مؤلفہ سید نور الدین بن سید عبد اللہ بن محمد نور اللہ، سنہ تالیف ۹۰۶ھ اور سنہ کتابت ۱۰۷۱ھ ہے، اوراد و اشغال شاہیہ میں ہی، ہر ماہ کے نوافل اور اوراد کی تعداد و تعویذات وغیرہ کا ذکر ہے،

(۲۲) **تہنیۃ الاسلام بخیر الاکمال والاتمام**، مؤلفہ سید محمد بن سید جعفر بدر عالم، (مع رسالہ حسن المقصد فی عمل المولد الشیخ جلال الدین سیوطی) یہ چھوٹا سا رسالہ حضور نبی کریم صلعم کی سیرت میں ہے،

(۲۳) **سفینۃ السادات**، مؤلفہ سید محمد قاسم بن سید عبد الرحمن برہ الحسنی بخاری، در ذکر سادات بخاریان، کتاب کے ۳۲ ابواب ہیں، باب اول سے ہشتم تک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ اثنا عشرہ وغیرہ کے نسب اور حالات ہیں، باب بستم میں ابی الحسین کبیر الدین کے حالات ہیں، باب بست و یکم سے حضرت ابی عبد اللہ جلال الدین مخدوم جہانیاں کے حالات ہیں، باب سی و دوم میں ابی عبد اللہ جلال الحق والدین محمد حسین بن سراج الدین محمد عابد کے احوال ہیں، خاتمہ میں آپ کے خلافت نامہ کا ذکر ہے، تالیف ۱۰۷۶ھ کتابت ۱۱۸۳ھ،

(۲۴) **صحائف السادات** (تین جلد) جن میں سے جلد کو صحائف سے منسوب کیا ہے (ضمیمہ اول دوم، سوم) حالات سادات بخاری، بھکری و شیرازی، مؤلفہ ہاشم بن کمال الدین محمد المشہور بکرار، کتابت ۱۱۱۴ھ

(۲۵) **رسالہ شاذلیہ کے دو اوراق**، اجازت نامہ از مولانا عبد الحق بن سیف الدین محدث دہلوی، اس میں آپ کے دست مبارک سے حاشیہ میں یہ عبارت تحریر ہے،

"بقدر الواسع والارکان علی ید مولفہ الفقیر المسکین العفو الی اللہ عبد الحق بن

سیف الدین الدہلوی ۔ ۔ ۔ البخاری غفر اللہ لہ ولوالدیہ الخ

سید جعفر بن سید مقصود عالم کے ہاتھ کی سنہ ۱۰۶۴ھ کی تحریر بھی ہے، یہ اوراق پھٹے ہوئے ہیں اس لئے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ اجازت نامہ کس کے نام ہے،

(۲۶) **شرح منیۃ العارفین**، شارح سید احمد بن سید رفیع الدین بن سید جلال محمد بن سید احمد جعفر شیرازی قدس سرہٗ، (تصوف عربی) کتاب کی ابتدا بسم اللہ کے بعد اسطرح ہوتی ہے،

"الحمد للہ الذی من علی اولیائہ بمجبۃ والتعلیم بالوحشۃ عما سواہ برحمتہ ۔ ۔ ۔
اما بعد فیقول العبد الذلیل علی باب الملک الجلیل الملتجی الی المولی الغنی احمد ابن السید رفیع الدین بن سید جلال محمد بن السید احمد جعفر الحسینی المدنی ثم الشیرازی ثم السندی ثم الہندی بصرہ اللہ بعیوب نفسہ وجعل یوم خیرا من امسہ الخ"

یہ تالیف سنہ ۹۹۲ھ کی اور کتابت سنہ ۱۰۱۲ھ کی ہے، کتاب کے سرورق پر سید جعفر بن جلال الثانی الرضوی اور (علامہ) نور الدین بن محمد صالح احمد آبادی کے دستخط بھی ہیں، آپ کے صاحبزادے محمد صالح بن نور الدین بن محمد صالح کے دستخط بھی ہیں، اس کی نقل حضرت پیر محمد شاہ احمد آبادی کی درگاہ کے کتب خانہ میں موجود ہے،

(۲۷) **فتوحات احمدی و رفیعی** مولفہ سید احمد بن سید رفیع الدین بن سید جلال ابن سید احمد جعفر شیرازی قدس سرہٗ بخط مؤلف (فارسی) در مناقب حضرت سید احمد جعفر الحسینی الشیرازی و سید رفیع الدین، کتاب کی ابتدا اس طرح ہے،

"الحمد للہ علی انعامہ المبین والصلوۃ علی نبیہ وحبیبہ سید المرسلین ۔ ۔ ۔
بعد میگوید بندہ ضعیف نحیف خاکسار ۔ ۔ ۔ احمد رفیع الدین سید جلال محمد ابن سید السادات صاحب اشرف المقامات السید شاہ احمد جعفر الحسینی الشیرازی بصرہ اللہ

بعیوب نفسہ وجعل یوم خیرا من امسہ آنکہ این بندہ طالب آں بود، در قطار مکان اولیاء اللہ خود را منسلک سازد ولیکن حیثیت مکتسب ہیچ نداشت" الخ

کتاب کے سرورق پر محمد صالح شیخ نور الدین صدیقی کی مہر سنہ ۱۱۳۰ھ کی اور بندہ اعفر نا والی سجادگی مہر بھی ہے،

(۲۸) **شجرۂ مبارک**، (عربی) سلسلہ من طبقات الاربع عشر مولفہ سید جلال بن سید رفیع الدین ابن سید جلال محمد بن سید احمد جعفر الحسینی الشیرازی، یہ عربی میں چار پیروں اور چودہ خانوادوں کا شجرہ ہے، نمبر (۲۶) (۲۷) (۲۸) کے نسخے راقم الحروف کے خاندانی تبرکات میں سے ہیں، جن کا تعلق حضرت سید احمد جعفر الشیرازی احمد آبادی متوفی سنہ ۹۲۲ھ سے ہے،

(۲۹) **نور العرفان** مولفہ شیخ محمد صالح عرف پیر بابا المتخلص بہ عرفان متوفی سنہ ۱۱۴۶ھ منقول از کتاب مؤلف، کاتب قاضی سید محمد نور الدین حسین ابن قاضی سید احمد حسین رضوی مرحوم سنہ ۱۲۸۰ھ، یہ رسالہ مؤلف نے احمد آباد کے مشہور مدرسہ ہدایت بخش کی تعریف میں ہے، جس کو احمد آباد کے صدر صوبہ نواب اکرم الدین خاں نے ایک لاکھ چوبیس ہزار کے صرف سے علامہ نور الدین صدیقی کے لئے تیار کیا تھا،

(۳۰) **نور المعرفت**، مؤلفہ شاہ محمد ولی المتخلص بہ ولی، یہ رسالہ بھی مؤلف نے مدرسۂ مذکور ہدایت بخش کی تعریف میں لکھا ہے،

(۳۱) **رسالہ نظامیہ**، مؤلفہ قاضی القضاۃ نظام الدین خاں، احمد آبادی، یہ چھوٹا سا رسالہ فارسی میں مؤلف نے مناکحت نکاح کی اجرت کے جواز میں لکھا ہے، نقل از رسالہ مؤلف کاتب قاضی سید احمد حسین بن سید محمد رضوی الشیرازی (جد راقم الحروف) سنہ کتابت سنہ ۱۲۴۳ھ

(۳۲) **تحفۃ العرفان**، مرتبہ محمد صالح عرف پیر بابا المتخلص بہ عرفان یہ چھوٹا سا رسالہ چہل حدیث کا فارسی ترجمہ ہے، مترجم نے یہ رسالہ شاہزادہ محمد معظم شاہ کی فرمائش سے ترجمہ کیا تھا،

کتب خانہ قاضی سید نورالدین حسین دہمی محلہ قضاۃ بھروچ کے کتب خانہ کی کتابیں،

(۲۳) **شرح فتوح الغیب**، شارح کا نام عبدالعزیز بن ولی ہے، اس کا خط باریک اور نسخہ نادر ہے جو شارح سے سید جعفر شاہ نقارضوی کو اوران سے شارح کے بھانجے احمد فاروقی کو ملا۔

(۲۴) **تذکرۃ الاعراس**، مصنف کا نام معلوم نہیں ربیع الاول سے صفر تک کے نامی بزرگوں کی وفات کی تاریخوں کا مجموعہ ہے، سرورق پر ۱۱۵۵ھ سید ابو طالب بن سید مشایخ دیوانجی الحسینی چشتی کے دستخط ہیں،

(۲۴) **مخزن الاعراس**، مولفہ شیخ نظام الدین چشتی اورنگ آبادی، مرتبہ ۱۱۵۵ھ منقول از نقل مولف، مولف نے اس مخزن کو چند نامی کتب مثل نفحات الانس، مراۃ الجنان، آداب لطائف سیرالاولیاء، اخبار الاخیار، گلزار ابرار، سفینۃ الاولیاء، طبقات شاہجہانی وغیرہ کے حالات جمع کرکے مرتب کیا ہے، ربیع الاول سے صفر تک کامل ہے،

بھروچ کا کتب خانہ

حکیم سید روح اللہ بھروچی جہانگیری

حکیم میر روح اللہ بن سید صبغۃ اللہ بھروچی شطاریؒ، بھروچ کے نامور حکیم اور عالم بزرگ تھے، شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے دور میں شاہی طبیب تھے، بھروچ کے باشندے تھے، علامہ حضرت شاہ وجیہ الدینؒ گجراتی سے آپ کو شرف تلمذ وارادت تھا، شہنشاہ جہانگیر اور نورجہاں کے معالج بھی رہے تھے، ان کو انعام میں جاگیریں بھی عطا ہوئی تھیں چنانچہ تھانب، کوکڑواڑہ، سوروا ڈی، اور جاورج مواضع آپ کی شاہی عطیہ میں تھے، مآثر رحیمی اور تزک جہانگیری میں آپ کے حالات ہیں، بھروچ میں آپ کا بڑا کتب خانہ تھا جس میں زیادہ تر طب کی کتابیں تھیں، مرور زمانہ اور تقسیم وراثت کی وجہ سے یہ علمی خزانہ منتشر ہو گیا، ان میں کی کچھ بچی کچی حسب ذیل طب میں نادر ہیں،

(۱) **فوائد الانسان**، مولفہ حکیم میر روح اللہ الحسینی بھروچی (فارسی) ۹۹۶ھ کی تالیف ہے، اور

صنعت توشیح میں منظوم ہے، اس کا تاریخی نام شہنشاہ اکبر نے شدہ اسمش فوائد الانسان رکھا، جس سے ۹۹۶ھ سنہ تالیف نکلتا ہے، کتاب ۲۸ ابواب میں منقسم ہے، اس میں ادویہ کے نام ان کے خواص، مفردات مرکبات وغیرہ نظم کئے ہیں، کتاب کی ابتدا اس طرح ہے،

"اللہ اکبر زہے حکمت ہمایوں و نعمت گوناگوں است کہ حکیم ذوالجلال و منعم بے زوال عم نوالہ و جل جلالہ از نہ سپہر و ہفت کشور در نظر والا گہر خدایگان داور عدیہ داد...... الخ

ذیل کی نظم سے کتاب کا نام اور سنہ تالیف وغیرہ کا پتہ چلتا ہے، مولف نے عبارت شدہ اسمش فوائد الانسان کو اس طرح نظم میں بیان کیا ہے،

ش	شکر حق گو دولے از دل و جاں	کہ بنامم خدایگان جہاں
د	در حکمت بہ نظم آوردی	شدہ شیرین خود دوا کردی
ہ	ہر چہ شہ گفت آنچناں گفتی	در مدح و ثنائے شہ سفتی
ا	آفریں شہ کہ آفرینش گفت	تو چہ گوہر فرائی از پے سفت
س	سر ہمت کہ پیش کردہ ماست	ہر در شاہ بندہ را ادلی است
م	محنت انجار سیدہ و راحت شد	مرہم سینہ جراحت شد
ش	شادمانی کنیم دست زنیم	کلمۂ فخر بر فلک فگنیم
ن	فکرتم چوں بامر اکبر شاہ	گشت بر نظم ایں گہر آگاہ
د	وقت خود را سہ سال پروردم	از گہر سہ ہزار آوردم
ا	از غذائے و دوائے خلق جہاں	جمع کردم فوائد الانسان
ی	یاور خود چو بخت شہ دیدم	نام آں را ز شاہ پرسیدم
د	داد تاریخ کہ مصرع است رواں	شدہ اسمش فوائد الانسان

ا   اسم و تاریخ ہر دو فہمیدم   مصرعہ کاں ز شاہ بشنیدم
ل   لازم آمد کہ سر بسجدہ نہم   داد و شکر و ثنائے شاہ دہم
ا   از خدا عمر و دولتش جوئیم   ہر چہ گوئیم دعائے شہ گوئیم
ن   ناظم این گہر دو ملے تو   در رہ بندگی فدائے تو
س   سر زند درین افادہ نبرد   باری از سنگ استفادہ نبرد
ا   آملش آنکہ بسپرد بجہان   یادگارے بنام شاہ زمان
ن   نام شہ باد زینت دفتر   ہست تا از دوا بدھر اثر

(۲) تقویم الابدان، مولفہ و مرتبہ یحیٰی ابن علیٰ بن جزلہ، کتابت ۸۸۸ھ، بحوالہ نقوش ...

یہ کتاب بخط عربی شیرہ خرمات سے لکھی ہوئی ہے، اس کی ابتدا اس طرح ہے،

"کتاب تقویم الابدان بجداو قالامراض المجتمعۃ فی ثلاثۃ اجناس متشابہۃ دالعیۃ و انفصال الاتصال و اسباب کل مرض و علاماتہ و تدبیرہ مونا یکثر فیہ من الامزجۃ و الاسنان والازمنۃ والبلدان۔۔۔۔۔۔"

(۳) مرحمت نامہ، مصنفہ محمود بن برہان بن محمود بن جلال الحسینی (در ادر فارسی) سنہ تالیف ۸۷۷ھ ہے، کتاب ۷ ابواب میں منقسم ہے، جس کو مرحمت سے منسوب کرکے مرحمت نامہ نام رکھا ہے، ابتدائی عبارت یہ ہے،

"اما بعد بندہ غریب بیچارہ محمود بن برہان بن محمود بن جلال الحسینی جعلہ من المتقین ۔۔۔۔۔ حضرت مقدسہ اجدی و شیخی و مرشدی قطب الاقطاب بندگی حضرت قطب العالم و ملازمت بابرکت اعظم خلفاء القطبیہ اشرفہم و اکرمہم سیدنا غوث الوری حسن العقیقہ القطبی الحسینی بنظارہ مستفید و مستفیض بودہ بارہ تبرکات بشمار سنین حیات معوری جلال الحق والشرع والدین مخدوم جہانیاں قدس اللہ سرہ العزیز فی سنہ سبعۃ و سبعین وثمانمایۃ در ہفت و ہشت مرحمت در بیاض آوردہ مرحمت نامہ بر بہانہ مسمی کردانی،،"

حکیم روح اللہ مرحوم کے خاندان میں بڑے بڑے نامور اطبا گذرے ہیں جن میں حکیم میر لطف اللہ حسینی، حکیم میر ابو المکارم، حکیم سید مصطفیٰ، حکیم میر ابو القاسم اور حکیم میر روح اللہ ثانی قابل ذکر ہیں، موخر الذکر حکیم روح اللہ ثانی نے فن طب میں لذت النجات نامی فارسی کتاب ۱۱۰۸ھ میں تالیف کی تھی، اس میں زیادہ تر مجرب نسخوں کا ذخیرہ ہے، چنانچہ اس کے دیباچہ میں اسطرح رقمطراز ہیں،

"چنیں گوید کمترین خلق اللہ الکریم اضعف العباد روح اللہ ولد حکیم میر مصطفیٰ اکریم از فرزندان حکمت و حذاقت پناہ۔۔۔۔۔۔ حکیم روح اللہ بھروچی، شاہ جہانگیری نور اللہ مرقدہ۔۔۔۔۔ بنابرآں این حقیر انچہ تدابیر و نسخہ جات دریں باب از کتب متقدمین و متاخرین من المجربات انچہ استادی قبلہ گاہی و از دیگر مجربات حکمائے ہند کہ رسیدہ است از روے انتخاب و تراکیب نادر دیدہ در سنہ ۱۱۰۸ھ یکہزار و یکصد و ہشت ہجری مقدسہ در سلک تحریر و تقریر در آوردہ الخ"

مذکورۂ بالا کتابوں میں ۱ بھروچ میں حکیم مرحوم کے خاندان اور حسے بھوہ کے جاگیردار سید حیدر صاحب بن سردار سید پیر صاحب کے کتب خانہ میں اور نمبر ۲ و ۳ سید محمود علی بن سید غلام علی صاحب جاگیردار آموڈ ضلع بھروچ کے کتب خانہ میں ہے،

شاہ کمال بھروچی قزوینی کا کتب خانہ

بھروچ میں حضرت شاہ کمال الدین بن صفی الدین قزوینی بھروچی قدس سرہ متوفی ۸۸۰ھ بڑے پایہ کے بزرگ اور ولی اللہ تھے، حضرت سید محمد گیسو دراز اورنگ آبادی قدس سرہ سے سلسلۂ چشتیہ میں آپ کو شرف ارادت حاصل تھا، آپ کی تصانیف کا صحیح پتہ چلانا مشکل ہے، تاہم آپ کی بعض تصنیف کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا علمی

بڑا کتب خانہ ہوگا، آپ کی دو تصنیفیں قابل ذکر ہیں،

(۲) **رسالہ بازار مصطفیٰ و خریدار خدا**، یہ چھوٹا رسالہ فارسی میں تصوف میں ہے، حضرت شاہ عالم احمد آبادی قدس سرہ متوفی ۸۸۰ھ آپ کی ملاقات کے لئے احمد آباد سے بھروچ تشریف لائے تھے اور آپ کے یہاں چالیس یوم قیام فرمایا تھا، اور حضرت شاہ صاحب نے "بازار مصطفیٰ و خریدار خدا" کے بارہ میں حضرت شاہ صاحب کے سوال کے جواب میں یہ رسالہ تالیف فرمایا تھا جس کا ذکر تذکرۃ الصالحین میں ہے، مولفہ منشی عبدالحکیم سورتی (تاریخ سورت) میں مذکور ہے،

(۱) **مظہر الحق فی بیان اباحۃ السماع**، یہ کتاب مذاہب اربعہ کی رو سے سماع کی اباحت میں فارسی میں تالیف کی ہے، دس بابوں میں منقسم ہے، (۱) در بیان مقدمہ دلیل احادیث و اقوال مشایخ کرام (۲) اباحت سماع در مذہب امام اعظمؒ بروایت صریح، (۳) اباحت سماع در مذہب امام شافعیؒ و امام مالکؒ و امام حنبلؒ وغیرہم، یہ کتاب بمبئی جامع مسجد کے کتب خانہ میں ہے،

مولانا اسحٰق بن عبدالوہاب کا کتب خانہ

بھروچ میں مولانا اسحاق بن عبدالوہاب قدس سرہ متوفی ۱۱۲۲ھ بڑے کامل بزرگ تھے، آپ حضرت فرید شکر گنجؒ کی اولاد سے تھے، احمد آباد کے مشہور عالم مولانا عبدالغنی تلمیذ حضرت علامہ شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی سے آپ کو شرف تلمذ و ارادت حاصل تھا، قلعہ بھروچ (موجودہ متصل بیگم باڑی) میں آپ کا ایک بڑا عربی مدرسہ اور کتب خانہ تھا، آپ کی عربی تالیف شرب الدخان، تمباکو کی حرمت میں ہے، یہ کتاب ۱۱۲۷ھ میں تالیف ہوئی، جس کا حوالہ مولانا عبدالحی لکھنوی مرحوم نے اپنی کتاب ترویح الجنان بتشریح شرب الدخان مطبوعہ مصطفائی میں دیا ہے، کتاب کی عبارت بسم اللہ کے بعد یوں ہے،

"الحمد للّٰہ الذی خلق الاشیاء کما شاء بحکمتہ واحل ما شاء لمن شاء بامرہ وحرم ما شاء لمن شاء بنہیہ وارسل الانبیاء لیبلغوا الی الناس،

موضع بھوہ بطور جاگیر آپ کو حکومت کی جانب سے عطا ہوا تھا، جو اب بھی آپ کی درگاہ کے سجادہ نشین سید حیدر صاحب ابن سردار سید پیر صاحب کے قبضہ میں ہے، بھروچ کے دو موضع محمد پورہ اور اسحٰق پورہ آپ کے صاحبزادے مولانا محمد انور اور آپ کے پوتے مولانا اسحٰق ثانی کے نام سے منسوب ہیں، آپ کے داماد ملا محمد علی ۱۱۳۰ھ میں بادشاہ کی جانب سے شہر احمد آباد کے قاضی و مفتی مقرر ہوئے تھے،

آمود ٹھاکر صاحب کا کتب خانہ ۱۸۷۸ء

بھروچ ضلع میں دریائے ڈھاڈھر کے کنارہ سے تھوڑے فاصلہ پر قصبہ آمود واقع ہے، یہاں کے نو مسلم گراسیہ ٹھاکر صاحب تھے، جن کا خاندان گجرات میں مولی اسلام کے نام سے مشہور ہے، ان کا بڑا کتب خانہ تھا، اس میں بقول ڈاکٹر بہولر (Bühler) ۱۸۷۵ء میں تین ہزار فارسی کی خوشخط منقش جرم کی مجلد کتابیں موجود تھیں، ان کی قیمت اس زمانہ میں چوبیس لاکھ اندازہ کی گئی تھی، ڈاکٹر بہولر اپنے سفرنامہ میں مورخہ ۳ نومبر ۱۸۷۵ء کے واقعات میں لکھتے ہیں[1]،

"میں مسٹر گرفتھس سے سفری اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد اور کھمبایت کے ریذیڈنٹ مسٹر ہولفرڈ سے سفارشی خط لیکر سرکاری کشتی (Ahmed boat) میں سوار ہو کر جمبوسر میں علی الصباح پہونچا، وہاں سے دریائے ڈھاڈھر پار کرکے صبح آٹھ بجے کنارے اترا اور آمود کی مسجد کے سامنے اپنا خیمہ ڈالا، صبح ۹ بجے میں نے راجہ (ٹھاکور) سے ملاقات کی، انھوں نے اس ملک کے رواج کے مطابق خیر مقدم کرتے ہوئے مجھ سے معانقہ کیا اور اپنے مکان کے قریب ایک جگہ جہاں کتب خانہ ہے لے گئے اور

---

[1] Bombay Government Records No XVI New Series.

بڑی خوشی سے اپنی کتابیں دکھلائیں، اور کہا ان کے والد نے ان کی قیمت ۱۲ لاکھ تخمینہ کی تھی، مگر ان کے نزدیک ان کی قیمت اس سے دگنی ہے، کتب خانہ میں تین ہزار جلدیں ہیں، جن میں فارسی کی مرقش چرم کی خوشخط قلمی کتابیں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں الخ؛"

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان اس گئی گذری حالت میں بھی کیتنے علم دوست تھے، اور کتب خانوں پر کتنا خرچ کرتے تھے،

میری محسن کتابیں

دوسرے دور کے رسالہ الندوہ نے ملک کے مشاہیر اصحاب علم و کمال سے ان کتابوں کے نام دریافت کیے تھے، جن کا اُن کی ذہنی تعمیر اور تشکیل سیرت میں خاص حصہ رہا ہے؛ اس کے جو جوابات موصول ہوئے تھے، وہ الندوہ میں میری محسن کتابیں کے عنوان سے شائع ہوئے تھے، اور بعد میں ان کو کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا تھا، اس میں نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولینا عبید اللہ سندھی، مولانا مناظر احسن گیلانی وغیرہ ہندوستان کے بہت سے اکابر اور اصحاب علم کے مضامین ہیں، جن سے عربی، فارسی اور انگریزی کی بہت سی اہم کتابوں کی خصوصیات اور متفرق معلومات حاصل ہوتے ہیں، قیمت عہ.

پچاس سے زیادہ نسخوں کے خریداروں کو معقول کمیشن دیا جائیگا، دار المصنفین اعظم گڈھ سے طلب فرمایئے،

"منیجر"

ادبیات

غزل

از جناب شفیق جونپوری

پھر ایسی زیست پہ کیا شوق خود نمائی ہو — کہ زندگی بھی جب اپنی نہ ہو پرائی ہو

زہے وہ رات کہ یاد حبیب آئی ہو — دراز اور بھی عمر شب جدائی ہو

فلک پہ چاند ہو دربان کو نیند آئی ہو — تمام رات اسی در پہ جبہہ سائی ہو

بچائے کون اسے اے ہوائے دامن دوست — کہ جس چراغ کو تو خود بجھانے آئی ہو

یہ کیا ستم ہے زمانہ کہے کہ صبر کرو — کسی غریب نے سینہ پہ چوٹ کھائی ہو

پھر ایسے خانۂ ویراں میں روشنی معلوم — جلی ہو شمع تو تقدیر مسکرائی ہو

وہ نامراد سہی نامراد کون کہے — ترے سپرد جو لے شان کبریائی ہو

مری فغاں سے جگر چاک ہو نگے اے بلبل — وہ تو نہیں کہ گلوں نے ہنسی اڑائی ہو

غضب ہو قافلۂ رنگ و بو کا لٹ جانا — کہ جب بہار کی منزل قریب آئی ہو

فلک کے تارے ہوں تلووں سے آبلے بنکر — ذرا دلوں میں مذاق شکستہ پائی ہو

ہزار ہو نگے ہم ایسے نگاہ و دل والے — جہاں میں تو ہو تری شان دلربائی ہو

جگا سکیں نہ مجھے باد تند کے جھونکے — وہ غم کی چھاؤں میں آنکھوں کو نیند آئی ہو

نگاہیں کھیل رہی ہوں شکستہ قبروں سے
صبا نے گورِ غریباں میں خاک اڑائی ہو

وہ نامراد کہاں داد خواہ ہو یارب
کہ جس کی جان کے پیچھے تری خدائی ہو

نہ چھیڑ بادِ سحر اس غریب غنچے کو
جسے چمن میں جوانی نہ راس آئی ہو

سلام اہلِ نظر اس کلی کی حسرت پر
بہار میں بھی جو دم بھر نہ مسکرائی ہو

وہیں سے فلسفۂ عشق کا ہے آغاز
جہاں خرد نے جنوں سے شکست کھائی ہو

وہ موت بھی بخدا دیکھنے کے قابل ہے
جو لے شباب ترے ساتھ ساتھ آئی ہو

جگہ خود آپ نہ دیں اپنے آستانے پر
قصور وار مقدر کی نارسائی ہو

وہی نگاہ کسی کو تباہ کر ڈالے
وہی نگاہ جدھر ہو ادھر خدائی ہو

شفیق اور شبِ ماہ و نغمہ لب جو،
وہ جانے جس کے چمن میں بہار آئی ہو

غزل

از

جناب اخلاق احمد صاحب قریشی،

جنونِ عشق کے ہاتھوں کہیں سودا نہ ہو جائے
مجھے ڈر ہے کہ رازِ ضبطِ غم افسانہ ہو جائے

ہماری التجاؤں کا اثر الٹا نہ ہو جائے
کہیں وہ اس سے بڑھ کر اور بے پروا نہ ہو جائے

غرورِ حسن بڑھ کر خود ہی اک پروانہ ہو جائے
ہمارے عشق کا چرچا کہیں اتنا نہ ہو جائے

تلاطم عشق کی دنیا میں اک برپا نہ ہو جائے
ہمارا ذکر بھی افسانہ در افسانہ ہو جائے

جنونِ عشق بڑھ کر اضطراب افزا نہ ہو جائے
مری دنیائے غم میں حشر پھر برپا نہ ہو جائے

قیامت اور کوئی آج پھر برپا نہ ہو جائے
ہمارے ضبط کی دنیا تہ و بالا نہ ہو جائے

ابھی تو ہوش باقی ہے مجھے جیب و گریباں کا
تمہاری یاد کیفِ نشۂ صہبا نہ ہو جائے

نشاط انگیز ہے کتنی تمناؤں کی دنیا بھی
الٰہی التفاتِ نرگسِ شہلا نہ ہو جائے

تمہارے حسنِ رنگیں کی لیے سرمستیاں تو ہے
فضائے دہر بھی پیمانۂ صہبا نہ ہو جائے

نسیم انکو دلِ محزوں کی کیفیت سناتی ہے
کہیں رودادِ غم بھی شکوۂ بیجا نہ ہو جائے

غزل

از مائل خیرآبادی

گلستاں میں لاکھ آئیں انقلاب
مستقل ہے فطرتِ خار و گلاب

ہو کلیمی ضرب تو پتھر بھی آب
ہو یقیں محکم تو آتش بھی گلاب

مردِ مومن ہوں مٹا سکتا ہے کون؟
میرے ہی دم سے ہے عالم فیضیاب

دے رہی ہے مجھ کو کیفِ آور پیام
وہ نظر جس کا فسانہ ہے شراب

گنگناتا ہے کوئی رگ رگ میں یوں
دور بجتا ہو کہیں جیسے رباب

آ رہی ہے پھر ہوائے نو بہار
اے چمن والو! نوید انقلاب

کیا ضرورت ہے ہمارے خون کی
پھیکا پھیکا سا ہے کچھ رنگِ گلاب

باغبانی یہ ہے دیکھ اے باغباں
ہے مری نظروں میں کانٹا بھی گلاب

نام کانٹوں کی بدولت ہو گیا
ورنہ تھا اک پھول گلشن میں گلاب

ہو رہا ہے پھر بھی کچھ ہوتا نہیں
ہائے اس دنیائے بیداری کے خواب

چاک دامن پر مرے ہنستا ہے کیا؟
دیکھ تو اپنا گریباں اے گلاب

کیا دلِ مائل کو پھر چھیڑا گیا
کروٹیں لینے لگا ہے انقلاب

مطبوعات جدیدہ

تصوف کی اہمیت:- از جناب وحید احمد صاحب بار ایٹ لا سکریٹری، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۸ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲ ر پتہ فرید احمد صاحب ۲۱ ہیولاک روڈ لکھنؤ،

یہ کتاب مصنف نے اس عامیانہ خیال کی تردید میں لکھی ہے کہ تصوف کو اسلام سے علاقہ نہیں ہے اور وہ دوسری قوموں سے ماخوذ ہے، اور یہ دکھایا ہے کہ تصوف "اسلام کی روح" ہے اور اس کے حامل صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی مقدس جماعت میں موجود تھے، جو دور اول کی خانہ جنگی کے زمانہ میں خانہ نشین ہو گئے تھے، اور یہ جماعت ہر زمانہ میں رہی اور اموی اور عباسی دور کی سیاسی پارٹیوں کے جدال و قتال اور مذہبی فرقوں کی قیل و قال سے جب اسلامی روح کمزور پڑنے لگی تو اسی جماعت نے اسکو بچایا اور اس کو زندہ رکھنے کی تدبیریں اختیار کیں، اور عہد صحابہ سے لیکر حضرت سید احمد بریلویؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے زمانہ تک تصوف و صوفیہ کی مختصر تاریخ اور ان کے بعض مسائل و احوال پر اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان کے جوابات دیئے ہیں، اصل تصوف کو مختصر طور سے سمجھنے کے لئے مفید کتاب ہے، البتہ امام ابن تیمیہ اور ابن قیم کو بھی یقین تصوف میں شمار کرنا صحیح نہیں ہے، ابن تیمیہ احسان کے منکر نہ تھے، بلکہ ان معنوں میں وہ خود صوفی تھے، البتہ تصوف کے بعض مروجہ غیر شرعی طریقوں کے خلاف تھے اور ابن قیم تو بڑے صوفی صافی تھے، تصوف کے معارف و حقائق پر ان کی معرکۃ الآرا اور ضخیم کتاب مدارج السالکین تصوف کی امہات کتب میں ہے، اسی طریقہ سے وحدۃ الوجود اور تصور شیخ وغیرہ کے مسائل کو در حقیقت

نفس تصوف سے تعلق نہیں، بلکہ یہ احوال و کیفیات اور ذوقی و وجدانی معاملات ہیں، جن کو علمی بحث کی قید میں لانا صحیح نہیں ہے،

فانی:- مولفہ جناب دیبی پرشاد صاحب سریواستوا ایم اے، منشی کامل لکچرار اے ایس کالج فتحپور، تقطیع اوسط ضخامت ۱۵۸ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ہے، پتہ:- کتابستان الہ آباد،

موجودہ دور کے شاعروں میں شوکت علی خاں مرحوم فانی کے کلام پر جس قدر لکھا گیا ہے وہ اس زمانہ کے اور کسی شاعر کے حصہ میں نہیں آیا، مصنف نے فانی پر یہ مستقل کتاب لکھی ہے اسمیں ان کے سوانح حیات اور ان کے کلام پر مفصل تبصرہ ہے، کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف صاحب ذوق سخن سنج بھی ہیں، اور اردو شاعری پر بھی ان کی نگاہ ہے، اس کتاب میں انھوں نے فانی کے کلام پر ذوقی اور فنی دونوں حیثیتوں سے اچھا تبصرہ کیا ہے، اور ان کے کلام کی خصوصیات دکھائی ہیں، انداز بیان دلکش اور ادیبانہ ہے، اس کتاب کو پڑھکر بے اختیار دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسی زبان کے ساتھ جس پر ایک ہندو کو اتنی قدرت حاصل ہے اور جس میں وہ ایسی ادیبانہ و معیاری کتاب لکھ سکتا ہے، اجنبی زبان کا برتاؤ کیا جا رہا ہے، اور اس کو مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے، یہ کتاب اہل ذوق کے مطالعہ کے لائق اور اردو ادب میں اچھا اضافہ ہے،

سلک گوہر:- میر انشاء اللہ خاں انشاء دہلوی، تقطیع اوسط ضخامت ۴۰ صفحے کاغذ نفیس، قیمت تحریر نہیں، پتہ کتب خانہ ریاست رامپور،

مشہور شاعر انشاء اللہ خاں کی شخصیت بڑی ہمہ گیر اور جدت پسند تھی، ان کو نظم و نثر کی ہر شاخ پر یکساں قدرت حاصل تھی، ان کی جدت پسندی کے نمونے ان دونوں صنفوں میں موجود ہیں، سلک گوہر بھی ان کی جدت طرازی کا ایک نمونہ ہے، یہ ان کی ایک بے نقطہ کہانی

ہے، اس کا قلمی نسخہ ریاست رامپور کے کتبخانہ میں ہے مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے اسکی تصحیح کرکے شائع کیا ہے، اس قسم کی جدتوں کی حیثیت ذہنی اپج سے زیادہ نہیں ہوتی، سلک گوہر بھی اسی قبیل کی اپج ہے، اس میں نقطہ دار حروف کے علاوہ ٹ، ڈ اور ڑ بھی جن پر اس زمانہ میں ط کے بجائے نقطے لگائے جاتے ہیں استعمال نہیں کئے ہیں، اس سے مصحح کے بقول، عبارت کی سانس رگھٹ گئی ہے، اور کتاب چیستان بن کر رہ گئی ہے، تاہم عبارت کا اجمالی مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے، اور یہ کتاب ایک قدیم ادبی یادگار کی حیثیت سے قابل قدر ہے،

سلک گہر جلد اول مولفہ جناب جاوید انصاری، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۸۰،۳ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ:- جاوید انصاری صاحب برہان پور،

دکن کا علاقہ اردو زبان کا مولد و منشا ہے، اس کے اثر سے اس کے پڑوسی صوبہ متوسط و برار میں بھی ہمیشہ شعر و سخن کا مذاق رہا، جو اب بھی قائم ہے، خصوصاً برہان پور کو تو ایک زمانہ تک اس نواح میں علمی و ادبی مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے، اسی سرزمین کے ایک نوجوان صاحب قلم جاوید انصاری نے صوبہ متوسط و برار کے قدیم شعراء کا یہ تذکرہ مرتب کیا ہے، اس میں بیاسی ۸۲ شعراء کے مختصر حالات اور ان کے کلام کا نمونہ دیا ہے، مؤلف کی یہ ادبی خدمت قابل قدر ہے،

نعت حضور از جناب بہزاد لکھنوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۶ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۱۲، پتہ مکتبہ برہان جامع مسجد دہلی،

مصنف کے کلام کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، ان کی نعتیں خصوصیت کے ساتھ زیادہ پرکیف ہوتی ہیں، اس میں وہ اپنے معاصرین میں ممتاز ہیں، نعت حضور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ان کی ۶۰ نعتیہ نظموں کا مجموعہ ہے، یہ نعتیں حسن ظاہر اور جمال معنی سے آراستہ اور نہایت موثر و دلپذیر ہیں انمیں شاعر کے اخلاص عقیدت کی روح جھلکتی ہو "م"

جلد ۶۴ ماہ شوال المکرم ۱۳۶۸ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۴۹ء عدد ۲

مضامین